

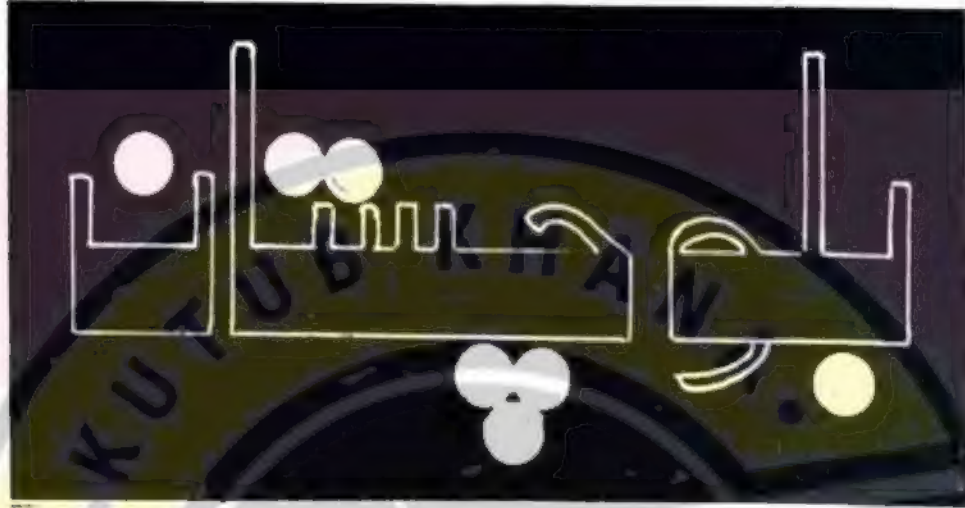
# بلوچستان

ماضی - حال - مستقبل

بریلگیڈیر محمد عثمان حسن  
ستارہٴ جرات







JALALI BOOKS

ماضیہ - حالہ اور مستقبلہ

JALALI

(ایک تجزیہ)





# ایلم حیات

ماضی — حال — مستقبل

ایک تجزیہ

برگیدٹر محمد عثمان حسن  
ستارہ جرات

ناشر

انڈس پبلیکیشنز

نریہ چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ  
کراچی۔ پاکستان

جملہ حقوق محفوظ



# فہرست

- ۹ \_\_\_\_\_ دیباچہ
- ۱۳ \_\_\_\_\_ اپریل ۱۹۶۴ء
- ۲۳ \_\_\_\_\_ جغرافیائی حالات
- ۳۱ \_\_\_\_\_ تاریخی پس منظر
- ۳۴ \_\_\_\_\_ وڑہ بولان
- ۳۴ \_\_\_\_\_ سیوستان
- ۳۵ \_\_\_\_\_ سیوی کی وجہ تسمیہ
- ۳۵ \_\_\_\_\_ مسلمانوں کی اس علاقے میں آمد
- ۳۶ \_\_\_\_\_ لاجہ طاہر
- ۳۶ \_\_\_\_\_ ارغونوں کا قبضہ
- ۳۶ \_\_\_\_\_ شاہ بیگ ارغون
- ۳۸ \_\_\_\_\_ شاہ حسن ارغون
- ۳۸ \_\_\_\_\_ پنیرلوں کی حکومت
- ۴۰ \_\_\_\_\_ نادر شاہ کا قبضہ
- ۴۱ \_\_\_\_\_ پنیرلوں کا دوبارہ قبضہ
- ۴۳ \_\_\_\_\_ فرنگیوں کا عہد
- ۴۳ \_\_\_\_\_ بلوچ قبائل
- ۴۵ \_\_\_\_\_ بلوچوں کا نسب
- ۴۶ \_\_\_\_\_ لفظ بلوچ کی تحقیق
- ۵۲ \_\_\_\_\_ تاریخ سے واقفیت کا اصل مقصد



تیس سالہ جنگ \_\_\_\_\_ ۵۵

مری انگریز کے دور میں \_\_\_\_\_ ۶۷

مری کی وجہ تسمیہ \_\_\_\_\_ ۶۹

مری قبائل \_\_\_\_\_ ۷۷

مری۔ آزادی کے بعد \_\_\_\_\_ ۷۹

جنگ رواج کا ایک جائزہ \_\_\_\_\_ ۸۷

فنون لطیفہ \_\_\_\_\_ ۸۹

جنگی تدابیر \_\_\_\_\_ ۱۰۱

حرکت \_\_\_\_\_ ۱۱۷

گشت اور جدت \_\_\_\_\_ ۱۲۷

ایک دن اور ایک صدی \_\_\_\_\_ ۱۳۳

مری قبائل کا رہن سہن \_\_\_\_\_ ۱۳۵

عمرانی \_\_\_\_\_ ۱۴۵

الف ملاقاتی کا جغرافیہ \_\_\_\_\_ ۱۴۸

ب تاریخ \_\_\_\_\_ ۱۴۸

ج نفسیاتی عمل \_\_\_\_\_ ۱۴۸

د عمرانی عمل \_\_\_\_\_ ۱۴۸

ر ذرائع معاش \_\_\_\_\_ ۱۴۸

الف مشترکہ ملکیت \_\_\_\_\_ ۱۴۹

ب ذرائع معاش \_\_\_\_\_ ۱۴۹

ج انتظامیہ \_\_\_\_\_ ۱۵۰

م تعلیم \_\_\_\_\_ ۱۵۰



ن ذرائع آمدورفت \_\_\_\_\_ ۱۵۰

صنعتِ نازک سے سلوک \_\_\_\_\_ ۱۵۱

آدم اور حوا \_\_\_\_\_ ۱۶۳

شاہی جسدِ گہ \_\_\_\_\_ ۱۶۱

کوہلو میں عید \_\_\_\_\_ ۱۸۵

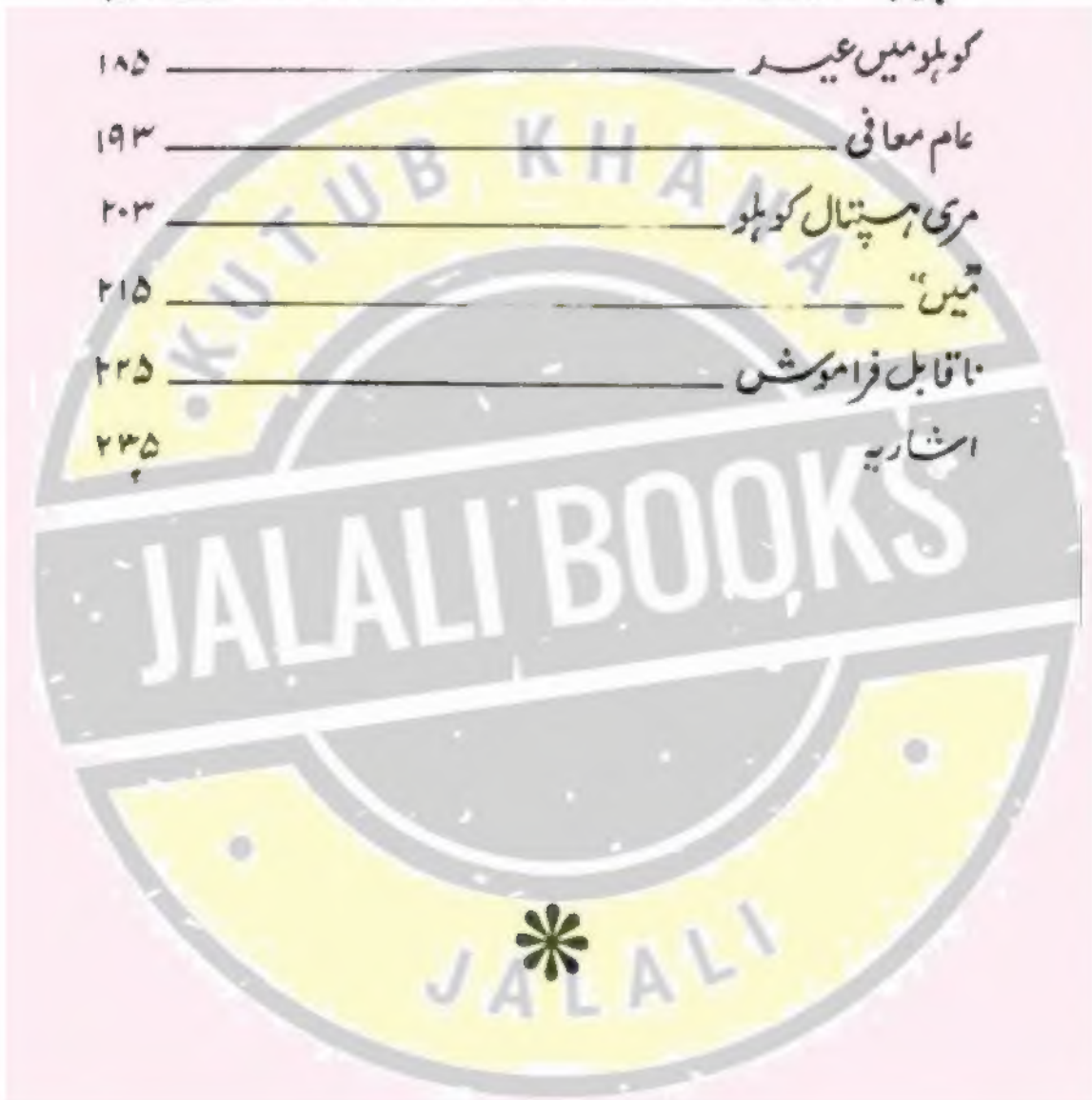
عام معافی \_\_\_\_\_ ۱۹۳

مری ہسپتال کوہلو \_\_\_\_\_ ۲۰۳

میں \_\_\_\_\_ ۲۱۵

ناقابلِ فراموشی \_\_\_\_\_ ۲۲۵

اشاریہ \_\_\_\_\_ ۲۳۵





## دیباچہ

۲۶ فروری ۱۹۷۴ء کو میں سیلی کوئٹہ سے کوہلو پہنچا اور مری علاقے میں سول حکام کی مدد کے لئے اپنی ذمہ داری سنبھالی۔ تقریباً ایک برس کے بعد فروری ۱۹۷۵ء میں اس علاقے سے واپسی ہوئی۔ ایک برس کا یہ عرصہ تیزی سے گزرا مگر اس دوران محبت اور اُنس کے جوڑے مری بھائیوں سے قائم ہوئے ان کو بھلانا کم سے کم میرے لئے ناممکن ہے۔

کوہلو میں قیام کے دوران یہ احساس ہوا کہ ہم لوگ اپنے ملک کے کئی علاقوں اور واپس والے بھائیوں کے بارے میں لاعلمی کا شکار ہیں۔ کراچی، لاہور، پشاور والوں کا تو ذکر ہی کیا کوئٹہ میں رہ کر محسوس کیا کہ قریب رہنے والوں کو بھی صحیح حالات کا علم نہیں۔ علم ہوتا بھی تو کیسے! جب لکھنے والے ہی اصل حقائق سے نا آشنا ہوں تو سچی بات کیسے سامنے آسکتی ہے! ایک خبر درست ہو سکتی ہے مگر صحیح تجزیہ پس منظر کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ تجزیہ کا بے لاگ ہونا ضروری ہے جب لکھنے والا اور پڑھنے والا دونوں ہی پس منظر سے نا آشنا ہوں تو کسی فرد یا ادارے کو حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں! اپنی ذیہنی کے دوران ملکی اور غیر ملکی اخباروں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ پڑھ کر تکلیف ہوتی کہ اکثر مضامین ایسے ہوتے کہ عین حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا! اکثر لکھنے والے یہاں کی تاریخ اور جغرافیہ سے ناواقف یا پھر ایک آدھ حکم چبایا جیب پر بیٹھ کر لگا جاتے اور اپنے آپ کو مری علاقے کے حالات کا ماہر تصور کرتے۔ ارادہ کیا کہ جب بھی موقع ملا تو جو کچھ سمجھی آنکھ سے دیکھا یا پڑھا اور کانوں سے سنا ہے ضرور تحریر کر دوں گا۔ اس کتاب میں میں نے اپنی ذاتی رائے محدود ہی رکھی ہے مگر جہاں ایسا کیا گیا ہے اس کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔



میری واپسی سے تقریباً چار ماہ قبل چند عزیز مری دوست ملنے آئے اور کہا کہ "اگر یہاں ایک فلاحی ادارہ قائم ہو جائے تو ہمارے علاقے کی ایک بڑی کمی پوری ہو سکے گی۔ اس کام کے لئے ہم لوگ مفت زمین فراہم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ایسے نیک کام میں شرکت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے رائے لی وہ بھی اس کے حق میں تھے۔ صرف فلاحی ادارے والی بات دل کو نہیں لگی اس کے ساتھ اگر ایک کتب خانہ بھی ہو جائے جہاں پر بنیادی طور پر وہ کتابیں مہیا کی جاسکتی ہیں جن کا تعلق اس علاقے سے ہے تو اور بھی اچھا ہوگا" اس کے علاوہ آپس میں اخوت محبت اور ربط کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے اگر پاکستان کے دیگر علاقوں کے لوگ خاص طور سے کلچر اور یونیورسٹی کے پروفیسر اور طالب علم چھٹیوں میں یا اپنے فاصلہ وقت میں اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کے لئے یہاں آجائے، میں تو ان کے ٹھہرنے کی جگہ ہو۔ جذبہ تو ہر ایک جوان آدمی میں ہوتا ہے مگر ضرورت سہولت اور رہنمائی کی ہوتی ہے اب دوسرے طبقے کے لوگوں کو لے لیجئے۔ کوئی ڈاکٹر ہے یا ذرا امت کا باہر اور کچھ نہیں تو ایسے علاقے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔ کچھ تو آسانی اور رہنمائی ہو سکے۔ بات تو ٹھیک ہے مگر پھر وہی سوال یعنی پیسہ کہاں سے آئے میرا عقیدہ ہے کہ نیک کام میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی بشرطیکہ نیت صاف ہو۔ کچھ کم ہمتی تکمیل میں حائل ہوتی ہے کہ تکلیف کون اٹھائے اور ہاتھ پیر کون ہمائے۔ یہ تکالیف تو ذاتی مفاد کے لئے وقف ہوتی ہیں، اکثر کوہلو میں صاحب حیثیت لوگ تشریف لاتے یا ایسے اشخاص جو اس کام میں مدد کر سکتے تھے۔ وعدے بھی کئے مگر وعدے کی حد تک ہم نے ذاتی کوشش بھی کی اور ہاتھ پیر ہمائے۔ جب کبھی بھی کوہڑا آنا ہوتا کوشش جاری رہتی۔ بیگم جیسے تنگ گئیں ایک روز کہنے لگیں کہ بس اب یہ کثرت رہ گئی ہے کہ وردی آمارو گلے میں جھولی ڈالو اور چند اکٹھا کرنا شروع کر دو" ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے مگر وقت کہاں سے نکالیں۔ جب کوہلو سے واپسی ہوئی تو ایک غلط فہمی دل میں رہی اس غلط فہمی کو اور بھی ہمارے دوستوں کے الوداعی جملوں نے تازہ کر دیا کہ "آپ تو کہتے تھے کہ جناب نیک کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ آپ تو اب جارہے ہیں۔"

ہمارا اب بھی اس پر یقین ہے اور بہت برقرار۔ وعدہ وعدہ ہوتا ہے۔ دوستوں کو جواب دیا کہ "جناب ہمارا ارادہ پہلے ہی کتاب لکھنے کا تھا اب ذرا جلدی کریں گے" اس کی ساری آمدنی اسٹیک اراؤسکی نظر ہوئی۔

"چاہے آپ کی کتاب کتنی اچھی ہو اتنی رقم حاصل کرنا کہ یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچے ناممکن ہے۔" اللہ کے نیک بندوں کی اس ملک میں کچھ کمی نہیں شاید کچھ اور لوگ ساتھ شامل ہو جائیں۔ جان بوجھ کر اس کتاب میں میں نے لفظ "میں" سے اجتناب کیا ہے اور لفظ "تم" استعمال کیا ہے ان کاموں میں میں ہی اکیللا تھا۔ بلکہ میرے اور ساتھی بھی برابر کے شریک تھے۔

کوٹہ

۲۰ اپریل ۱۹۴۷ء

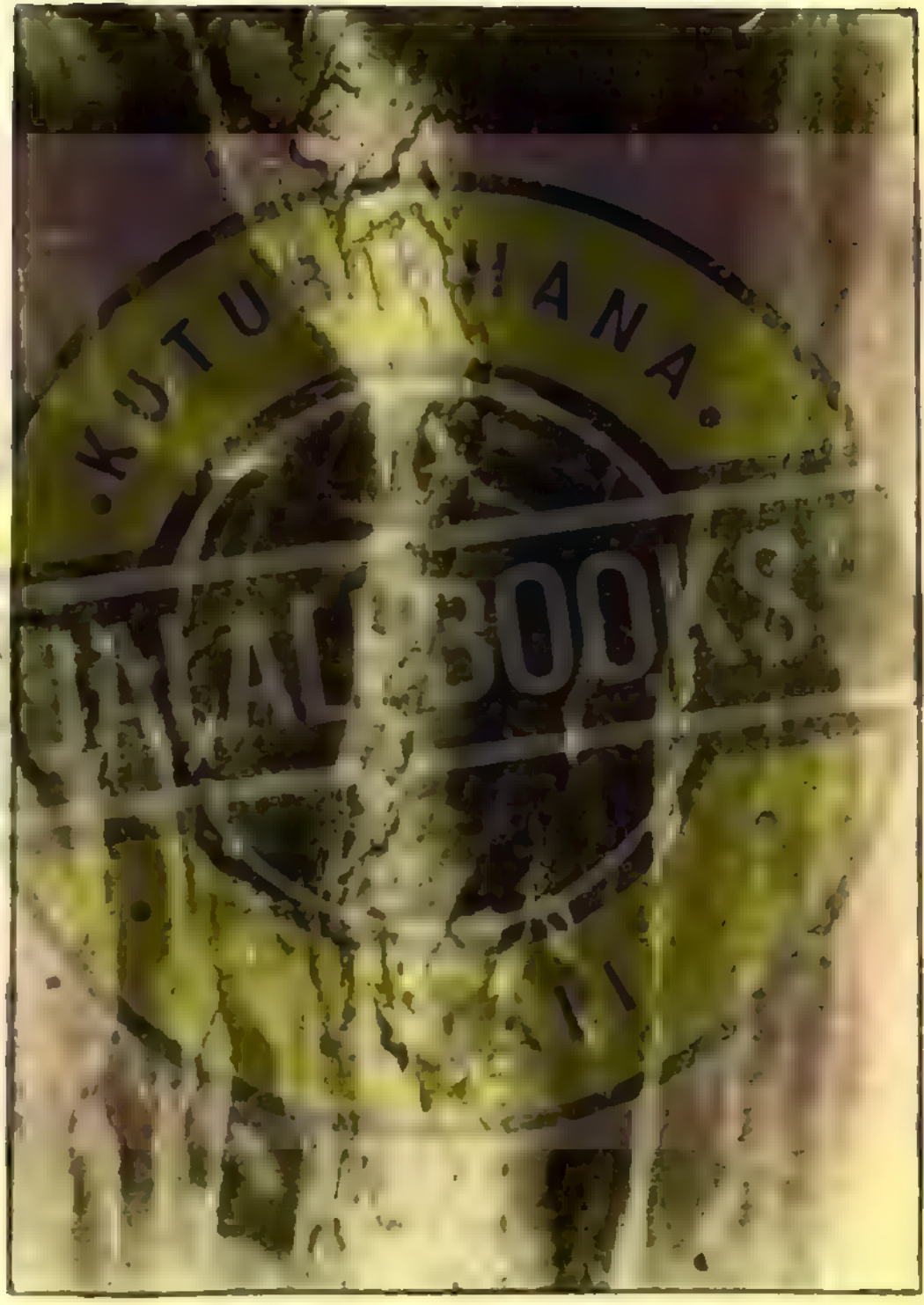
ابو یحییٰ میر محمد عثمان حسرت  
(ستارہ جہرات)







مری سہ ماہی کے ایک منظر





## اپریل ۱۹۷۲ء

اپریل ۱۹۷۲ء کی بات ہے 'مُری علاقے میں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ یہاں کی تاریخ، جغرافیہ اور حالات سے کوئی زیادہ واقفیت نہ تھی اور ان غیر یقینی حالات میں ایسی معلومات کا جاننا فرد کی تھا۔ اپنی طرف سے کوشش جاری تھی۔

کتابیں اور دیگر مضامین کافی پڑھ ڈالے تھے۔ میں اپنے ذہن میں مری علاقے کا ایک دھندلا سا خاکہ بنانے کو چلو پہنچا۔ اپریل کا مہینہ یہاں عامہ خوشگوار ہوتا ہے۔ نہ زیادہ گرمی اور نہ زیادہ سردی مگر پھر یہ بھی بے رونقی اور نواسی کیسی؟ سڑکوں کے قریب علاقے فیر آباد۔ آبادی کا دور دورہ تک پتہ نہ تھا۔ کوٹلو کا بازار افسردہ اور بچھا سا۔ ان دنوں اکثر تباہ و برباد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پہاڑوں پر چٹانیں نہیں تھیں آبادی نظر آتی تھی۔ بھیر بکریاں بھی خُرقی دکھائی دیتی تھیں 'مگر فضا میں ہر وقت وہی عجیب سی بے رونقی۔ اکثر یہ خبریں ملتیں کہ آج فلاں جگہ فار ہوا ہے یا اس علاقے میں کوئی واردات رونما ہوئی ہے کبھی جگہ پر تھرر مکمل رکاوٹ کھڑی کر دی گئی ہے یا کسی بستی سے فرار پٹی 'بھیریں لگے ہیں یا پھر رات کو کہیں لوٹا



کی گئی ہے۔ جناب! نظم و نسق قائم کرنا تو پولیس اور سول انتظامیہ کا کام ہے، آپ کا ان باتوں سے کیا تعلق؟ پولیس اگر سبوتب۔ رہی سول انتظامیہ، تو وہ ایک تحصیلدار پر مشتمل تھی اور کچھ ہی مرحلے پہلے ایک پولیسٹیکل ایجنٹ صاحب بھی بہ نفس نفیس پہنچ گئے تھے، مگر عملہ ندارد۔

در اصل یہ علاقہ نظم و نسق کے لئے سب سے ڈسٹرکٹ کے تحت تھا اور ویسے بھی یہاں قبائلی نظام رائج تھا جس کا ذکر وضاحت سے آگے کیا گیا ہے۔ یہاں ایک نئی ایجنسی مری جیٹی ایجنسی کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ اہلکاروں کی تقرریاں ہو رہی تھیں۔ ابھی تک ریکارڈ سب سے بڑا تھا، نظم و نسق سنبھالتے سنبھالتے بھی تو دیر لگتی ہے۔ قبائلی علاقے کی نوعیت اس طرح سمجھیں کہ پاکستان کے اندر ایک اور سلطنت اور اس میں حکومت سرداروں اور وڈیروں کی۔ انگریزوں کے زمانے ہی سے یہ دستور چلا آ رہا تھا، حال ہی میں نظام بدلنے کی کوشش کی گئی تو دشواریاں درپیش آئیں۔

ایک روز سڑک کھلنے کا دن تھا، اردو لکھنا ہے تو ٹیک سے لکھیں۔ "سڑک کھولنا" ایک نئی سی بات لگتی ہے۔ سڑک نہ ہوئی بقول شخصے بوتل ہے کہ کارک کھولنے کی نوبت آگئی سڑک تو ہر وقت کی آمدورفت کے لئے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ سڑک واقعی کھولی جاتی تھی۔ ہر وقت آمدورفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سڑکیں کراچی، کوئٹہ، پشاور کی مال روڈ تو نہ تھیں کہ جب مٹی آتے موقع محل دیکھے بغیر سیر و تفریح یا کام سے نکل کھڑے ہوئے، اچھا پاکستان ہے کہ سڑک بھی کھولی جاتی ہے جناب! اس علاقے کو ماضی میں پاکستان کس نے سمجھا ورنہ یہ نوبت کیوں آتی۔ سڑک کھولنے کی اصطلاح تخریبی کارروائیوں کے آغاز سے رائج ہوئی اور اس سے مراد تھی کہ جب بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہو تو سڑک پر حفاظتی دستے مختلف مقامات پر تعینات کیے جائیں اور رکوپ کرنے۔ اس کے ساتھ ایک حفاظتی دستہ بھی لازمی تھا تاکہ تخریبی کارروائیوں سے نقصان نہ ہونے پائے۔ جب سڑکوں کی لمبائی سینکڑوں میل سے بھی زیادہ ہو تو دستے کہاں کہاں لگائے جائیں اور کیسے بچاؤ کیا جائے؛ میدانی علاقہ ہو تو اور بات ہے پہاڑوں میں ہر جگہ اور ہر موڑ خطرناک ہوتا ہے۔ جہاں مرنی آتے بیٹھ کر فارغ کریں اور پھر غائب پیچھا کرنے والے کو تو وقت لگتا ہے۔ بالفرض اگر کوئی پیچھا کرے بھی تو غار میں گہرے نالے ہیں، جھاڑیاں ہیں، چھپ جائے۔ خدا کی ساری زمین خالی پڑی ہے، ذکر ہو رہا تھا سڑک کھلنے کا تو

جناب کو ہلو، لورالائی کی سڑک کھول گئی۔ یہ فاصلہ سو میل سے زیادہ کا ہے۔ گاڑیاں صبح ہی جا چکی تھیں سوچا کہ موقع اچھا ہے لگے انھوں جیپ پر بیٹھ کر خود بھی علاقہ دیکھ لیا جائے۔ جب تک محوم پھر کے علاقہ دیکھ لیا جائے تو بات نہیں بنتی۔ محض نقشے سے علاقے کی نوعیت کا اندازہ لگانا مشکل کام ہے۔ ہمیشہ زمین اور حالات کا صحیح اندازہ علاقہ دیکھ کر ہی ہوتا ہے۔ ویسے اللہ کے فضل سے نقشے بھی بہت پرانے انگریز کے زمانے کے ہیں۔

ابھی کو لوہے سے نکل کر کچھ میل طے کیے ہوں گے کہ یکایک فائر کی آواز سنائی دی۔ گاڑیوں کو روکا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ واقعی فائر کی آواز ہے یا کان دھوکا دے رہے ہیں۔ اگر آواز ہے تو کس سمت سے آرہی ہے اور کتنے فاصلے پر ہے۔ سامنے چند میل پر کبانا لگا کا پیار ہے۔ یہاں پر سڑک بل کمانی ہوئی پانچ میل اندازاً دو ہزار فٹ بلند ہو جاتی ہے۔ اس پہاڑ کی چڑھائی شروع ہونے سے پہلے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آتی ہیں جو کافی فطرتاً ہی آگے والے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ دور دراز سے آگے کو غم کے آگے کیا بیت رہی ہے۔ اونچائی پر اگر آدمی رائفیل لے بیٹھے ہوں تو بڑی آسانی سے نیچے والوں کو چن چن کر ختم کر سکتے ہیں۔ آپ نیچے سے بیچا کرنے کے لئے اوپر چڑھیں تو صرف ڈائٹ اور بھی عمدہ بنتا ہے۔ وہاں لگائی تھی کہ فائر کی آواز مزید تیز ہو گئی۔ گولیوں کی آواز پہاڑی علاقے میں کافی گونجتی ہے اور آواز کا پیچ رخ کا پتہ پلانا مشکل ہو گیا۔ اس پہاڑی علاقے میں گولیوں کی گونج سے یوں لگتا تھا کہ ہر طرف سے فائر ہو رہا ہے۔

دور میں سے بل کھاتے ہوئے راستے کو دیکھنا شروع کیا تو اپنی گاڑیاں رکی ہوئی پائیں۔ کچھ آگے لے کر پیچ چکی تھیں۔ کچھ ابھی اوپر پہنچی تھیں باقی اسی طرح چڑھائی پر نیچے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ فائر کی آواز کچھ دیر کے لئے سہم ہوئی تو پھر ایسا معلوم ہوتا کہ بے شمار لوگ ایک دوسرے پر گولیوں کی بارش کر رہے ہیں پہلے تو صرف رائفیل کے فائر کی آواز سنائی دے رہی تھی اب معلوم ہوا ہے کہ مشین گن سے بھی فائر ہو رہا ہے۔ تخریب کاروں کے فائر کی آواز بالکل مختلف ہوتی ہے لیکن اگر سب ساتھ مل کر فائر کریں تو اس آواز اور مشین گن کے فائر میں تفریق کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا اور آن کی آن میں کالے کالے بارل آسمان کی طرف اٹھنے شروع ہو گئے۔

ہماری جیب کے نیچے وارلینس کی گاڑی اور پھر تیسری گاڑی میں دس آدمیوں کا خفاقی دستہ تیار ڈرائیو نے آہستہ سے کہا "شاید اپنی کسی گاڑی کو آگ لگ گئی ہے فائر کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ خیال آیا کہ موقع پر ملے گا۔ پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا جائے۔ حادثے کو اپنی نظر سے دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ آپ ہزار روپوں میں پڑھتے رہیں کہ تخریب کار کس طرح کارروائی کرتے ہیں مگر روپوں سے اندازہ نہیں ہوتا۔ ایک پرانے امریکن جنرل کا قول یاد آیا۔ ایک نظر سے خود دیکھنا ہزار روپوں سے بہتر ہے۔"

جیب کو اسٹارٹ کیا اور گنا وانگاک کی راہ لی اور ہم گرد گرد کا بادل اڑاتے، بچکولے کھلتے آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

سب کی نگاہیں پہاڑ کی جانب تھیں اور کان فائر کی طرف۔ گاڑیاں تیزی سے بڑھ رہی تھیں ڈرائیو نے موٹر پر بریک لگاتے تو پیچھے گھسٹتے۔ گرد اڑتی اور پھر ایکسیلیٹر دبا کر رفتار دلیے ہی برقرار رہتی۔ جلنے والی دارو دارو لگا ہوں گے سامنے آتی اور پھر اوجھل ہو جاتی۔

اب سامنے سڑک کا سیدھا گڑا تھا۔ یہ نصف دو فر لائٹ کا سوگا اور پھر سڑک چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گزرتی ہوئی بائیں کو مڑتی تھی۔ ان پہاڑوں کے دامن میں ایک گاؤں آباد ہے اور اسے بالکل پیچھے اونچے پہاڑ۔ گاؤں کو دیکھتے ہیں تھوڑے دن ہوئے اس گاؤں کی مسجد میں اور الائی سے آتے ہوئے جمعہ کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ان گاؤں والوں سے اکثر آتے جلتے ملاقات بھی ہوتی ہے سڑک کے کنارے ایک کنواں ہے جس کا پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ جب کبھی سفر میں دیر ہو جاتی ہیں رگ کر تھوڑی دیر سہا بجاتا۔ اس گاؤں سے جائے واردات کچھ ہی آگے ہوگی۔ چڑھائی تو دراصل یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے آگے جائیں پہاڑ اونچے اور چڑھائی مشکل تر۔

ایسے حالات میں طرح طرح کے خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ پتہ نہیں اپنا کیا نقصان ہوا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر کیا کرنا چاہیے؟ ایسی کارروائی کی جائے کہ تخریب کار بچ کر نہ جائیں۔ موقع پر پہنچ کر دائیں سے گھیر ڈالا جائے۔ کوہلو بھی اطلاع دی جائے کہ جو بھی دستے موجود ہیں وہ فوراً یہاں آجائیں۔ گنا وانگاک کے پہاڑ کی دوسری جانب "لوہار کی ٹم" کانوجی کیمپ ہے۔ انہیں بھی ہدایت کی جائے کہ گیسے کو تنگ کریں۔ یہی

خیالات دماغ میں آ رہے تھے کہ ایک ایسی سلسلے سے دو گولیوں کا فائر سنائی دیا۔ تخریب کاروں کا یہ اشارہ تھا کہ اب سب مل کر فائر کریں۔ گمت میں بیٹھ کر اس طرح پہلے صرف دو گولیاں چلانے کا تعلق انسانی نفسیت سے ہے۔ وہ یہ کہ جب گاڑیاں آگے بڑھ رہی ہوں تو ایک دکاندار کی آواز سن کر ڈرامہ رگبرگسٹ میں گولیوں کی رفتار تیز کر دیتے ہیں اور پھر اکیدم سے ایک اندھے موٹر کے پاس جا کر پھنستے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور پھر فائر چاروں طرف سے تند اور تیز۔

گولیوں کی آواز سننے ہی جیب کو بائیں موڑا اور وہ چھوٹے سے مالے کے کنارے جا کر مگ گئی۔ ہم لوگ چستہ بک نکال کر مالے سے اُترے ہو گئے۔ پہلی گولیوں کی بو پھساڑ اس بگڑے آبی مدھرے جیب مڑی تھی اور پھر جیب کے اوپر اترتے اترتے بھی کچھ گولیاں پار ہو چکی تھیں۔ اب تو عالم یہ تھا جیسے مین کی چھت پر اُلے گر رہے ہوں۔ جیب چونکہ نیز تھی اس لئے باقی گاڑیاں کافی پیچھے رہ گئیں جب انہیں یہ عالم نظر آیا تو دائر لیس کی گاڑی پیچھے رُک گئی مگر حفاظتی دستے کب پیچھے ہٹنے والے تھے۔ عقلمندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ گاڑی کو فوراً چھوڑ کر کارروائی پیل کی جاتی۔ مگر جوش میں جوش کم ہی رہتا ہے۔ گاڑی کو دبا اور گولیوں کی بو چھاڑ میں عین جیب کے پاس لاکھڑا کیا۔ تیزی سے کوڑکے سب باہر آ گئے۔ آڑے کو فار کا جواب دینا شروع کر دیا اس اٹنا میں ایک جوان کے پاؤں میں گولی لگی لیکن وہ زخمی حالت میں بھی آڑ میں بیچہ چیکا تھا۔

فائر دونوں جانب سے شروع تھا آگے والی گاڑیوں پر اب فائر ختم ہو چکا تھا اور تختہ مشق ہم لوگ تھے۔ آڑ میں بیکر دور بین لگائی بہت کوشش کی کہ دیکھیں آخر فائر کرنے والے کبہر ہیں اور کیا سے گویاں آ رہی ہیں۔ مگر کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ہاں! اتنا ضرور اخذ کر سکے کہ فائر گاڈائے پیچھے پیارٹیوں کی جانب سے ہوا تھا۔ فائر کرنے والوں کی تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔

حفاظتی دستے کا کمانڈر ایک حوالدار تھا۔ مگر کیا کہنے اس کی ہوشمندی کے بشین گن کو ہدایت کی کہ وہ وہیں سے فائر جاری رکھے اور خود باقی آدمیوں کو ساتھ لے کر دائیں سے گیار ڈالنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس حرکت کو دیکھ کر شاہ زار، بہت رگڑے ہوئے اور شرمیلے ہوئے گھبراہٹ سے دایر لیس کی گاڑی کی طرف



پکے تاکہ باقی لوگوں کو بھی ہدایت دی جائیں۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ہمیں یار لوگوں نے نشانہ بازی کی مشق جاری رکھی مگر نشانہ کوئی خاص نہیں تھا: جیسے اب تک سننے میں آیا تھا۔

کوہلو خبر پہنچ چکی تھی۔ جو بھی بچے کچے دستے تھے گاڑیوں میں آگے آ رہے تھے۔ دستے کے جوان لمبا چکر کاٹ کر پہاڑ کے دامن میں جیسے ہی پہنچے ان پر پھر فائر ہوا۔ یہ ظاہر تھا کہ تخریب کار نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہاڑیوں کا سلسلہ اتنا گنجان ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ایک پہاڑی عبور کی تو دوسری آگئی۔ دوسری کو پار کیا تو تیسری آگئی اور پھر اونچائی ایک سے ایک بلند۔ اونچائی پر بیٹھا ہوا آدمی نیچے سے آنے والے پر ہر وقت نگاہ رکھ سکتا ہے اور جبھر سے بھی وہ چڑھنے کی کوشش کرے اور جھجکا کر دوبارہ راستے میں حائل۔ حفاظتی دستے پر جہاں فائر آتا وہ اور دائیں جا کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے اور پھر وہی عالم تقریباً آدھ گھنٹے بعد کوہلو سے تیس جوان اور پہنچ گئے تھے۔ سب کو ہدایت یہی تھی چھپاؤ چھوڑا جلتے۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے بھی پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ آگے گاڑیوں پر فائر ختم ہو چکا تھا ظاہر تھا کہ تخریب کار نکل چکے تھے۔ ہم لوگ آگے چلے اور بجائے واردات پر پہنچے۔ ایک جوان شہید ہو چکا تھا اور دو زخمی تھے۔ انہیں اسپتال کی گاڑی پر کوہلو روانہ کیا۔ ایک گاڑی جل چکی تھی اور باقی دو گاڑیوں کو نقصان پہنچا تھا۔ ان گاڑیوں کے ساتھ جو حفاظتی دستہ تھا وہ بھی تخریب کاروں کا ہتھیار کرتے ہوئے کافی آگے نکل چکا تھا۔ لوہار کی دھکم دھکم میں جو کچھ نوجوان مرگ کی حفاظت سے بچے تھے انہیں بھی چھپا کرنے کی ہدایت کی گئی۔

یہ کارروائی کرتے کرتے سہ پہر ہو چکی تھی۔ وائس پر خبر ملی کہ ایک ایسا ہی حادثہ منڈے ٹک پہر ہوا ہے۔ یہ جگہ دکی سے سات میل شمال میں واقع ہے۔ وہاں پر اپنے سات جوان شہید اور تین زخمی ہوئے ہیں شام کو دستے واپس آئے تو ان کے ہمراہ تقریباً چالیس ہتھیار آ دی تھے۔ یہ سارے گیم کے بیسنے تھے ہتھیار چھپانے میں یہاں ہر ایک ماہر ہوتا ہے توڑا بھی وقت ملے تو اسلحہ کا چیلنا ناممکن ہوتا ہے۔ ہر ایک قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے شک والی بات ضرور تھی۔ ایسے میں جوش کی بجائے ہوش کا قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان حالات میں نادانستہ بھی اگر بے گناہ کو تنگ کیا جائے تو اس کی ہمدردی بھی دیکھ

جانب ہو جاتی ہے اور اگر گناہگار بچ جائے تو اس کا حوصلہ اور بلند ہو جاتا ہے۔ سوچا کہ شک کا فائدہ بے گناہ ہی کو ملنا چاہیے یہی عقل مندی ہے اور سب سے بڑی بات ایسی ذات کو جواب دینا ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ بجا۔ عقل اور ہوش اسی وقت تک ساتھ دیتے ہیں اگر جذبات پر قابو بزرگوار سے جذبات کو حدود میں رکھنا آسان کام نہیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو دنیا میں امن ہی امن ہوتا۔ ”جوش“ اور ”ہوش“ کی بات اپنی جگہ درست مگر آنکھوں اور کانوں کا کیا کچھ! حادثہ تو آپ کے سامنے ہے۔ انسان اپنے جذبہ کو بدل نہ سکتا ہے۔ بات دراصل ”ایمان“ پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ جذبات بھی قابو میں آجاتے ہیں اگر راہِ عقل پر یقین ہو یعنی کہ بے گناہ کو نہ ستایا جائے آنریہ جی پاکستانی ہیں۔

آخر انسان ہی تو بنے خیال آتا ہے کہ یہ بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس طرح گولیاں برس نے کا مطلب! بغاوت تو پہلی جاتی ہے سمجھانے سمجھانے سے کیا حاصل۔ بغاوت کرنے کا بھی کوئی مقصد ہوتا ہے ایسے ہی کوئی راتقل لائے سینہ ان کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اپنا بھائی اس طرح کھڑا ہو بھی گیا تو کیا اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہیے جو کہ باہر والے حملہ آور کے ساتھ کرتے ہیں فرق تو دونوں میں ہے۔ ایک پاکستانی اور دوسرے سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں۔! ہر والا اگر ایسی حرکت کرے تو وہ آپ کی آزادی پر ہلکا ستھ ڈال رہا ہے مگر اپنے لوگ تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کوئی تو وجہ ہوگی۔ مان یا باہر والوں کا ہاتھ ان کو اکسانے میں ہوگا۔ مگر کچھ تو اسیاں بھی ضرور شامل مال ہوں گی۔

ان معاملات میں سب سے اہم یہ تھا کہ حالات کا بے لاگ جائزہ لیا جائے، آخر یہ نوبت کیوں پہنچی حالات کو کسی ایک زاویے سے دیکھنا غلط ہوگا۔ اس کا تجزیہ تو کلی طور پر ہی کیا جاسکتا ہے یہاں کے جغرافیہ اور تاریخ کو پڑھیے۔ معاشی حالات اور سماجی حالات کو سمجھیے۔ انتظامیہ کو جدید تقاضوں کی نظر سے جانچئے تعلیمی معیار اور نفسیات کو بھی نظر انداز نہ کیجیے۔ ان سب عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے مائت کامل تلاش کیجئے اور نظر ہمیشہ دور مستقبل پر ہو۔ جہاں اتنے عناصر کا خیال رکھنا ضروری ہو تو حالات ایک دم

اور کسیر تو بدل نہیں سکتے۔ بدلتا دور اپنا وقت لے گا۔ اس میں رکاوٹیں بھی ہوں گی اور مشکلات بھی۔ حالات جب سازگار نہ ہوں تو باہر والے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ہمارے ہی ساتھ نہیں بلکہ جہاں بھی ایسے حالات ہوں یہی ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی تو بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔

طاقت کا استعمال کسی حد تک ان حالات میں جائز بھی ہوتا ہے۔ امن و امان برقرار رکھنے کے لئے۔ تاکہ ان عوامل پر کاربند ہوا جائے جن کی فوری ضرورت ہے اور ان وجوہات کا تدارک کیا جاسکے جن کی بنا پر حالات اس نوبت کو پہنچے۔ مگر طاقت کے استعمال کی جب بات آئے تو پھر صرف یہ خیال ہو کہ یہ علاقہ بھی پاکستان کا حصہ ہے اور یہاں بھی اپنے بھائی بستے ہیں۔ برداشت اور تحمل کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے۔









حکومتی زمینوں پر غلط استعمال - قبائلیوں سے تعارف کرایہ دار ہے

## جغرافیائی حالات

مری علاقہ کی پرانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک گزیر نظر سے گزرا اس میں مری اور گجٹی علاقہ کا حدود درجہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا تھا مری گجٹی ۲۶' ۲۸" تا ۳۰' ۳۰" شمال اور ۵۵' ۵۶" تا ۵۸' ۴۹" مشرق میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۲۹ مربع میل ہے اس کا شمالی حصہ جو ۶۸ مربع میل بنتا ہے مریوں کے قبضے میں ہے باقی ماندہ ۳۸۹۱ مربع میل پر گجٹی آباد ہیں۔ یہ تمام علاقہ ابھی تک بستی ضلع میں شامل تھا مگر دیکھتے دیکھتے علیحدہ مری گجٹی ایجنسی قائم ہو گئی ہے جس کا صدر مقام کوٹلوہ ہے۔ یہ مری علاقے میں واقع ہے۔

مری علاقے کے شمال مشرق میں دکی اور بارکھان کی تحصیلیں آتی ہیں جو کہ لوہالاٹی کا حصہ ہیں۔ جنوب میں نصیر آباد کی تحصیل ہے مشرق میں اس کی حد ڈیرہ غازی خان سے جا ملتی ہے اور مغرب میں کچھی اور بستی کے اضلاع ہیں۔ سرکاری بیان کے مطابق تو یہ اندراج صحیح ہے مگر یہ کہنا کہ مری صرف انہی علاقوں میں آباد ہیں۔ دُرُست نہیں بلکہ مشابہے کے مطابق تقریباً ۲۰۰۰ مری اس علاقے سے باہر بھی ہوتے ہیں ان کی زیادہ تر آبادی دکی، سجاوی، بارکھان اور بستی تحصیلوں میں بھی آباد ہے مری علاقوں میں کچھ فرقوں

پٹھان بھی ہیں لیکن یہ زیادہ تر کوہلو کے گرد و نواح میں ہیں۔ دراصل وادی کوہلو پہلے زرقون کی ملکیت تھی۔ مگر ۱۸۷۷ء میں بگٹیوں نے مریوں کی اجازت سے اس علاقے پر حملہ کیا۔ زرقون اپنی زمینیں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر ۱۸۷۸ء میں مریوں نے زرقونوں سے صلح اس شرط پر کی کہ وادی کا تین چوتھائی حصہ انہیں دے دیا جائے اور اس کے بدلے میں وہ انہیں بگٹیوں سے محفوظ رکھیں گے۔

بلوچستان میں علاقے کی بانٹ قبیلوں سے بھی ہوتی ہے یعنی کس علاقے میں کون سا قبیلہ آباد ہے اب مری علاقے کے چاروں اطراف کا جائزہ لیتے ہیں۔ شمال میں دکی کی تحصیل آتی ہے اس تحصیل میں 'ترین'، 'دنی'، 'ناسرا' اور زرقون آباد ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی حدود ہیں۔ مگر ان حدود کے اندر بھی کافی علاقے میں مریوں کا قبضہ ہے۔ پھر شمال میں بارکھان تحصیل ہے یہاں پر کینہران آباد ہیں۔ کینہران ایسے لوگ ہیں جن کی اپنی علیحدہ زبان ہے جو سندھی اور جاتیکی سے کافی ملتی جلتی ہے۔ مگر بلوچی، پشتو اور پنجابی بھی فر فر بولتے ہیں۔ جنوب میں بگٹی ہیں جن سے ان کی دوستی ذرا کم ہی ہے۔ مغرب میں تہی کا ضلع ہے۔ یہاں پر بلوچوں کے کچھ قبائل جیسے ڈومکی، رمیانی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پٹھان بھی آباد ہیں لیکن ایک بات جو بڑی واضح ہے وہ یہ کہ مری قبائل کا پلہ سب پر حاوی ہے۔ ماسوائے دنیچیوں کے جو ہمیشہ سے ان کے ساتھ برابر کی مکر لیتے رہے ہیں۔ پڑوسیوں کے ساتھ مری قبائل کے تعلقات اکثر کشیدہ ہی رہتے ہیں۔ مریوں کو بہر حال اپنے جانوروں کے لئے چراگاہیں چاہئیں۔ یہ ان کا سب سے بڑا کام ہے یہ کام ایک جگہ بیٹھ کر تو نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کاروبار تو گھوم پھر کر ہی ہوتا ہے۔

ذکر تو ہو رہا تھا حدود اور راجہ کا۔ پہلے اس پر۔ وی نظر ڈالتے ہیں اب اس علاقے کو جغرافیائی نظر سے دیکھتے ہیں ویسے تاریخ اور جغرافیہ تو ہمیشہ سے اپنی کمزوری رہی ہے مگر کوشش کئے لیتے ہیں یہ علاقہ سلیمان رنج کا انتہائی جنوبی حصہ ہے یہاں پر اس سلسلے کی پہاڑیاں ایک دوسرے کے قریب قریب متوازی پھیلی ہوئی ہیں۔ ان متوازی پہاڑیوں کا سلسلہ سلیمان پلیٹو سے شروع ہوتا ہے اور ان کی اونچائی جنوب میں آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے اور پھر یہ میدانی علاقے میں شامل ہو جاتی ہے۔ مری علاقے میں میدانی علاقہ بہت کم ہے۔ یہاں پر کھادوت مشہور ہے سارے پہاڑ مریوں کے میدان و گرد

کا۔ یہ کہاوت پوری طرح تو درست نہیں مگر کچھ تو اس میں سچائی ضرور ہے پہاڑیوں کے درمیان اُن گنت چھوٹی چھوٹی وادیاں اور گہرے برساتی نالے ہیں۔ مغرب میں سب کے میدان سے تھوڑی ہی دور مری علاقے کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کی اونچائی ۲۰۷۱ فٹ ہے ۲۲۲۲ فٹ ہے شمال مشرق میں ان کی اونچائی بڑھتی جاتی ہے۔ دنگن کی اونچائی ۵۲۷۰ فٹ ہے اور سب سے اونچا پہاڑ مسباوہ ہے جس کی بلندی ۸۱۱۳ فٹ ہے۔

اس علاقے کا دھلوان زیادہ تر مشرق سے مغرب کی طرف ہے۔ سب سے بڑا برساتی نالہ جسے یہاں دریا کہا جاتا ہے ناڑی ہے۔ اس میں گرمیوں میں بھی پانی بہتا ہے بس یہ سمجھئے کہ پانی کی ایک عمار ہے جو کہیں بہتے بہتے گم ہو جاتی ہے لیکن تھوڑے فاصلے کے بعد نمایاں ہوتی ہے اور پھر گم۔ مگر سب کے نزدیک دریا میں متواتر پانی بہتا رہتا ہے اس سے آبپاشی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ برسات میں تو خیر یہ پورا دریا ہو جاتا ہے۔ مری علاقے میں اسے بھی کہتے ہیں۔ یہاں پر اس میں دو اور نالے شامل ہو جاتے ہیں جنہیں ”کریک“ اور دارا کہتے ہیں۔ دوسرا نالہ دریا ”تلی“ ہے۔ یہ بھی مری علاقے سے نکلتا ہے اور سب کے میدان میں بہنے جاتا ہے اس میں اور نالے بھی شامل ہو جاتے ہیں جیسے ”چاکر“ اور ”شلوار“ وغیرہ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ میوند اور سب کے کو ملانے والی سڑک چاکر کے ساتھ بنائی جا رہی ہے۔

مری علاقے کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ ویسے گرمی اور سردی میں بہت ہی فرق ہوتا ہے۔ سردیوں میں کثرتاً علاقے میں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے کم ہو جاتا ہے اور گرمیوں میں سستی اور اس کے رد گرد کا علاقہ بہنم زار بن جاتا ہے۔ یعنی صرف ۱۵ ڈگری درجہ حرارت۔ اونچی پہاڑیوں کی بات جدا ہے سالانہ بارش کا اوسط کہا جاتا ہے۔ پانچ انچ ہے۔ بادل برسات اور سردیوں دونوں ہی میں آتے ہیں مگر اس اوسط میں بعض برسوں میں کافی فرق پڑتا ہے۔ یعنی کسی سال بارش دس پندرہ انچ ہو جاتی ہے بعض دفعہ خشک سالی بھی۔ گرمیوں میں نیز بارش ایک ہوتی ہے اور ندی نالے دیکھتے دیکھتے تیس سے چالیس فٹ بلند ہو جاتے ہیں اور پھر اسی رفتار سے پانی اتر بھی جاتا ہے۔ اگست اور ستمبر میں آندھیاں چلتی ہیں اور مئی جون میں گرد و فبار کی شدت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سو گز بھی دیکھنا مشکل۔



ان حالات میں نباتات یہاں تھوڑی بہت نظر آتی ہے۔ ماسوائے اس جگہ کے جہاں پانی ہو۔ جیسے کچھ وادیاں تمام علاقہ جھلسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مالوں کے ساتھ ساتھ۔ وادیوں میں یا کچھ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیاں ہوتی ہیں جنہیں اگر کاٹا نہ جائے تو درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کچھ انہی جھاڑیوں یا درختوں کے جنگل بھی ہیں۔ یہ اس وجہ سے بچ گئے کہ وڈیروں کی نجی ملکیت تھے۔ سردیوں کے آخر اور گرمیوں کے وسط تک اگر بارش ہوگئی تو سبزہ جال ٹھٹھا ہے ہری ہری گھاس اور مختلف قسم کے ابلہاتے پھول وادیوں میں اور پہاڑوں پر کھل اٹھتے ہیں۔ ان میں چرتی ہوئی سفید بھیریں ایک عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔

بقول اقبال :- پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

جب جغرافیہ نباتات بارش اور جانوروں کا ذکر ہو رہا ہے تو لگے ہاتھوں اس کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ بارش کا تعلق ہمیشہ نباتات سے ہوتا ہے۔ جتنے درخت ہوں گے اتنی ہی زیادہ بارش اس علاقے میں ہوگی۔ اگر درخت کاٹ دیے جائیں تو بارش کم ہو جائے گی۔ یہاں پر صدیوں سے لوگوں کا ہمیشہ جانور پالنا رہا ہے۔ چرائی ہوتے ہوئے نباتات کم ہوتی جا رہی ہے۔ پرانی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر کافی گھنے جنگل ہوتے تھے مگر اب یہ ختم ہو چکے ہیں اور بارش بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وسطی افریقہ میں گیتانی صحرا بڑھتا ہی جا رہا ہے اور پچھلے ساں تو ایسی قحط سالی ہوئی کہ خدا بچا نہ۔ اس کی وجہ بھی ماہرین نے یہ بیان کی کہ وہاں پر بھی چراگاہیں ہیں اور وہاں کے قبائل نے اتنی زیادہ مال کی چرائی کی کہ ریگستان چند برسوں میں بڑھ کر ان علاقوں میں پہنچ گیا۔ دس سال قبل وہاں پر جانور رکھنے کے سلسلے میں قبائل پر پابندی تھی یعنی کہ ہر قبیلہ ایک خاص تعداد سے زیادہ جانور نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر پچھلے دس برسوں میں یہ پابندی ختم کر دی گئی۔ سو اس کا نتیجہ جو ظاہر ہونا تھا وہ ہوا بہر حال جانور بھی رکھنا ضروری ہیں مگر حد کے اندر۔

یہاں بارش کم ہونے کی وجہ سے پانی کی بڑی قلت ہے۔ میلوں چلے جائیے پانی ناپید۔ اگر بارش زیادہ نہ ہو تو جو پانی ملتا ہے وہ بھی مکین کہیں کہیں چستے ہیں۔ آبادی کا سارا دار و مدار پانی

اور بارش پر ہے۔ اگر بارش اچھی ہوگئی تو چراگاہیں آباد۔ ورنہ لوگوں نے بوسہ بستر اٹھایا اور گھاس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مگر اب حالات کچھ مختلف ہوتے جا رہے۔ زیر زمین پانی کا سروسے مکمل ہو گیا ہے اور ٹیوب ویل بھی لگ رہے ہیں۔ پانی کے تلاش کے کام کی اگر یہی رفتار رہی تو انشاء اللہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کے حالات بدل جائیں گے مگر زیر زمین پانی کو نکالنے کے لئے بھی تو بارش کی ضرورت ہے لہذا نباتات کی حفاظت پر ابھی سے غور اور عمل ضروری ہے۔





علی گل ٹھینگانی۔ مصنف کے ساتھ







بہارِ وفاں کیونٹی سینٹر کے ایک اسکول میں

## تاریخی پس منظر

جغرافیہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہاں کی تاریخ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مری علاقے کی تاریخ ابھی تک پردہ خفا میں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درہ بولان قریب ہونے کی وجہ سے مختلف قومیں اس علاقے میں آتی باقی رہیں ان میں سے بعض قومیں ایسی تھیں جو یہیں کی ہو کر رو گئی تھیں۔ یہاں کی تاریخ پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ نانا تے کو قرار کہاں۔ افسوس ہے کہ اس علاقے کی کوئی معتبر تاریخ ابھی تک متب نہیں ہوئی بہر حال ہیں جو یہاں کی تاریخوں میں ملتا ہے ہم اے اور یہاں کے لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ہے ہم ان تمام تاریخی حقائق کو یکجا کر کے بیان کرتے ہیں یہاں کی تاریخ کی تحقیق کے سلسلے میں ہم نے بڑی بادیہ پیمائی کی ہے مری علاقے کا تفصیلی دورہ کیا اور اس پاس کے لوگوں سے بھی استفسار کیا۔ بہت سے معززین کے پاس قلمی نسخے بھی دیکھے۔ انہوں نے پہلے تو دکھانے میں تامل کیا اور کہا اگر آپ پڑھنا ہی چاہتے ہیں تو یہیں بیٹھ کر پڑھیں۔ ان کی یہ بات بھی درست تھی۔ یہ نادر کتابیں کہاں مل سکتی ہیں۔ اکثر صاحبان نے مال مٹول سے کام لیا، جس میں نے بہت انحراف کیا اور کہا جناب! علم کے معاملے میں بخل کسی طرح مناسب نہیں مگر ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ ہے دراصل یہاں

لوگ اپنی خاندانی تاریخ اور ورثے کے بارے میں بہت ہی حساس واقع ہوئے ہیں اور خدا جانے اسے کیوں پردہ خفایں رکھنا چاہتے ہیں مگر علم کے معاملے میں ان کی کنجوسی تو کسی طرح مناسب نہیں۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر ان نادر کتابوں کو کسی طرح اکٹھا کر کے قومی لائبریری یا میوزیم میں محفوظ کر دیا جائے تو یہ ادب اور تاریخ کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔

## درہ بولان

چونکہ درہ بولان سے یہ تذکرہ شروع ہوا ہے تو پہلے ہم اس تاریخی پس منظر کو دیں سے شروع کرتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے اس علاقے میں جو ہمیشہ سے مشہور شہر رہا ہے سبی ہے۔ اس کی اہمیت آج بھی قائم ہے، یہ پہلے حکومتوں کا دار الخلافہ ہوتا تھا مگر آج کل ایک فلمی سیڈ کوارٹر ہے بقول شخصے یہ شہر درہ بولان کے منہ پر واقع ہے، اگر آپ ہوائی جہاز سے یہاں پرواز کر رہے ہوں تو یہ منہ کا محاورہ اور بھی چلتا ہے شمال میں تمام پہاڑ کول پور کے گرد و نواح میں بہت اونچے اور یہ پہاڑوں کا سلسلہ متوازی جنوب کی طرف پھیلتا چلا جاتا ہے اور ان کی اونچائی بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ جہاں یہ پہاڑ ختم ہو کر میدان شروع ہوتا ہے وہیں پرستی کا ہوائی اڈہ ہے۔ پھر اس کے بعد قلعہ اب قلعہ کبارہ گیا ہے کھنڈرات ہیں کسی زمانے میں یہ قلعہ اپنی مثال ایک تھا۔ اور تھوڑا آگے سبی کا شہر ہے۔

## سیوستان

پرانے زمانے میں درہ بولان اور ڈیرہ جات کے نیچے علاقے کو سیوستان سے منسوب کیا جاتا رہا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیوستان کا صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے یہاں تک کہ اب یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ کون سے علاقے سیوستان میں شامل تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دریائے سندھ اپنا راستہ بدلتا رہا ہے اور جو پہلے حدود رہی ہوں گی وہ اب بدل چکی ہیں اور پھر ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جگہوں کے نام تیزی سے بدلتے رہے اور نئی نئی حکومتیں اور نئی نئی حدود قائم ہوتی رہیں۔

## سیوی کی وجہ تسمیہ

اس علاقے کی مشہور اور عامی روایات کے تحت یہاں کے قدیم باشندے ہندو تھے جنہیں "سیوا" کہا جاتا تھا اور انہیں کی یہاں حکومت تھی یہ ۴۰۰ سے پہلے کی بات ہے۔ انہیں حکمرانوں میں سے ایک ہندو رانی گزری ہے۔ جس کا نام سیوی تھا۔ اسی کے نام پر "سیوی" شہر آباد ہوا اور کثرت استعمال سے سب سے پہلے یہاں اب بھی یہاں عورتوں کے ناموں میں "سیوی" بہت مقبول ہے۔

ہندوستان میں سکندر اعظم کی جنگوں کا جب ذکر آتا ہے جہاں اور قبیلوں کا بیان ہے وہاں "بی" یا "سیا" کا نام بھی لیا جاتا ہے، مگر اس ضمن میں نام کی بی یگانگت پائی جاتی ہے۔ اور اس کا شہر سستی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ بات نہایت ہی غلط طور پر مشہور ہو گئی ہے کہ یہاں سکندر اعظم کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔

## مسلمانوں کی اس علاقے میں آمد

تقریباً پچھونسویں سیوی میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا بلوچستان اور سندھ سے تعلق ہوا بلاذری جو مشہور عرب تاریخ دان ہیں ان کے بیان کے مطابق حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے گورنر عبداللہ بن جراح کی سربراہی میں بلوچستان اور سندھ کی طرف ایک بحریہ کا مشن روانہ کیا جائے تاکہ وہاں کے حالات سے واقفیت ہو سکے۔ چنانچہ حکیم بن بلال اللہی اس کام پر متعین کیا گیا۔ ان کی رپورٹ کے مطابق کہ اس علاقے میں پانی بالکل ناپید ہے پھل میں مگر کھانے کے قابل نہیں۔ چور اور ڈکوبرا روک ٹوک ظلم ڈھاتے ہیں۔ جیسے ظالم لوگ ہیں ایسا ہی ظالم علاقہ۔ تھوڑی فوج کے لئے کامیابی ناممکن ہے۔ بڑا لشکر بغیر رسد نہیں ٹھہر سکتا۔ حضرت عثمان غنی کو تعجب ہوا کہ یہ حقیقت ہے یا شاعری۔ جس پر حکیم بن بلال اللہی نے جواب دیا "حقیقت ہے" کہا جاتا ہے کہ خلیفہ سوم نے اس علاقے پر حملے کا ارادہ ترک کر دیا۔

حضرت علی کے خلافت کے دور میں حارث بن مرہ العبیدی نے بلوچستان کی سرحد پر چڑھائی کی۔ بیش بہا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ پھر دور معاویہ میں بھی باقاعدہ اس علاقے پر لشکر کشی ہوئی یہ بات محمد بن قاسم سے پہلے کی ہے۔



ایک روایت کے مطابق اس وقت راجہ سہارائے اس علاقے کا حکمران تھا اس کا دار الخلافہ "الور" تھا۔ سنہ ۱۱۰۰ء کے وسط میں اس نے حکومت دور دراز کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ عربوں کے ہاتھوں اس راجہ نے مکران میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ لیکن میر معصوم جو سندھ کے مشہور تاریخ دان مانے جاتے ہیں ان کے مطابق یہ عرب نہیں بلکہ ایرانی۔ یعنی بادشاہ نیمرذ کی جو فوج فارس سے چلی اور براہ کمران ہوتی ہوئی کیچ اور مکران پر حملہ آور ہوئی۔ اگر میر معصوم صاحب کی یہ بات درست مان لی جائے تو یہ واقعہ چھ سو مدی عیسوی سے پہلے کا ہوگا۔

ایرانی یا عرب حملہ آوروں کے بعد سہارائے کے بیٹے "سہاسی" نے حکومت سنبھال لی جیسا کہ ہوا کرتا ہے۔ سہاسی کے برہمن وزیر رائے پنج نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور اس نے چالیس سال تک سندھ اور اس علاقے پر حکومت کی۔

### راجا داہر

رائے پنج کا بیٹا جسے آج کل رسوائے زمانہ کہا جاسکتا ہے مشہور راجا داہر تھا اسے ۱۱۰۰ء میں جو ان سال جنرل محمد بن قاسم نے شکست دے کر برصغیر میں اسلامی حکومت کو مستحکم کیا اور وہ مکران اور سندھ کو فتح کرتا ہوا ملتان تک جا پہنچا۔

جب ہم اس علاقے یعنی سہی اور اس کے گرد و نواح کا تاریخی تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مری گہٹی کا علاقہ بھی کسی حد تک اس میں شامل ہے۔ لیکن یہ خیال ہے کہ یہ علاقہ خاص طور پر قبیلہ بلوچستان سے کچھ الگ تھلگ سا ہے اس کی وجہ پیاروں کا سلسلہ ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی اس کا تعلق برہنہ خراسا کے ملتان اور کچھی سے زیادہ رہا ہے۔

محمد بن قاسم کی فتح کے بعد تقریباً ۶۱۱۰ء تک اس علاقے کی تاریخ کا کوئی خاص پتا نہیں چلتا بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ ہم نے اس دور کی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی یا یوں کہیے کہ ہم نے معلوم کرنے کی کوشش تو کی لیکن اپنی مجبوریوں کی وجہ سے یہ کہہ کر اپنے آپ کو یہ سمجھایا کہ ایک سپاہی کے لئے اتنا ہی جہان بہت کافی ہے۔ ۶۱۱۰ء کے شروع میں سہی کا علاقہ محمود غزنوی کی حکومت میں شامل تھا۔ جنہوں نے



نے سندھ کا رخ کیا اور بتدریج ۱۵۲۰ء میں اس نے ٹھٹھہ فتح کر لیا۔ پھر وہ اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لئے گجرات کی مہم پر روانہ ہوا۔ اسی مہم میں جب وہ موضع انکم پہنچا تو درویشینہ میں مبتلا ہو کر ۲۲ شبان ۹۲۸ھ کو اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

### شاہ حسن ارغون :

شاہ یگ کے بعد اس کے بیٹے شاہ حسن نے حکومت سنبھالی۔ چونکہ اب سلطنت وسیع ہو چکی تھی اس نے اس علاقے کو سلطان محمود کے سپرد کیا۔ سلطان محمود بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ۱۵۲۲ء میں جو علاقہ آج کل مری گئی اچینسی کہا جاتا ہے اس نے اس کی طرف خاص توجہ دی۔ میر معصوم صاحب کے مطابق سلطان محمود نے کئی بلوچی قلعوں کو فتح کیا اس نے اس علاقے کے جنگجو لوگوں کی اچھی خاصی خبر لی اور انہیں امن قائم رکھنے پر مجبور کیا۔ سلطان محمود نے اس علاقے میں نئے قلعے بھی تعمیر کرائے۔ ہم نے ایسے قلعوں کے کمنڈرات کئی جگہ خود بھی دیکھے ہیں اب تو صرف فصیلوں کے نشان باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فوجی نقطہ نگاہ سے جن جگہوں کا تعین کیا گیا تھا۔ آج بھی اہم ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا یعنی ۱۵۲۳ء کا جب ہمایوں ہندوستان چھوڑ کر تبت سے تباہو گزر رہا تھا شاہ حسن کی وفات کے بعد ہندوستان کے شہنشاہ اکبر کی حکومت زوروں پر تھی۔ سلطان محمود نے اپنے صوبے کو شہنشاہ کی حکومت میں شامل کرنے کی درخواست کی یہ قبول ہوئی یہ اوپر کے ۱۲ جلدوں اور ۱۵۱۱ء کی یاد دہانی کے بحکام آکر شاہ کی طرف اس کے صوبے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ سلطان محمود نے ۱۵۴۳ء میں وفات پائی۔

### پنیریوں کی حکومت :

یہاں پر تو یہی عالم رہا ہے کہ جب بھی حکومت کمزور ہوئی امن و امان قائم رکھنا مشکل سلطان محمود کی وفات کے فوراً بعد سبکی اور اس کے گرد و نواح پر پنیریوں نے قبضہ کر لیا۔ پنیری غزنی کے پٹھان یا افغان ہیں۔ جیسے جیسے ارغونوں یعنی ترکوں کا زور کم ہوتا گیا۔ پنیریوں کی طاقت بڑھتی گئی اب چونکہ ارغون کمزور ہو چکے تھے جھگڑا مغلوں اور پنیریوں کا تھا۔ ۱۵۷۶ء سے ۱۵۹۵ء تک کبھی مغل سبکی کے علاقے پر قابض ہوئے تو کبھی پنیری۔ بالآخر فتح مغلوں کی ہوئی۔ ۱۵۹۵ء میں میر معصوم جو مشہور تاریخ نویس

تھے یہاں کے گورنر مقرر ہوئے انہوں نے اس علاقے کا نقشہ یوں بیان کیا ہے۔ علاقہ سبی اور گندوا کے حدود اربعہ کچھ اس طرح سے ہیں۔ ست پور کا پہاڑی سلسلہ جو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ یہ کن کے گاؤں اور زمینوں سے ہوتا ہوا سیوی اور باتامک پہنچ جاتا ہے جو کہ قندھار کے زیر اثر ہے۔ سیوی کا علاقہ ایک آدمے چکر کی شکل بناتا ہے اور پھر دریائے سندھ سے جاملتا ہے۔ یہ درمیانی علاقہ دشت ہے اور قندھار جانے کے لئے اس دشت کے بیچ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس علاقے کی لمبائی سیوی سے دیا کے کنارے تک سو کوس کا فاصلہ ہے اور چوڑائی ساٹھ کوس۔ اس علاقے میں سال کے چار مہینے میں بمبوم ”کرم ہوا“ چلتی ہے۔ یہ یہاں گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں دشت کے بیچ میں گاؤں اور قلعے ہوا کرتے تھے جو اب ختم ہو چکے ہیں۔

اس دشت کو تھوڑا بہت ہم نے بھی گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ چٹیل میدان ’میلوں تک پانی کا نام و نشان تک نہیں پہاڑوں کے کنارے پر کچھ چٹے نظر آتے ہیں جو کہ گرمیوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی کنوئیں میں پانی موجود ہے ’آبادی پائی جاتی ہے۔ میٹھا پانی تو برائے نام ہے البتہ تقریباً سارا ہی پانی کھار ہے۔ بس کہیں زیادہ اور کہیں کم۔ ایک بات ضرور ہے کہ سارے میدان علاقے میں جا بجا کھیتوں کی منڈیریں بنی ہوئی ہیں۔ حالانکہ وہاں کوئی کھیت موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ ماضی میں زیر کاشت ضرور رہا ہوگا۔ کہیں کہیں جھاڑیوں کے جنگل بھی ہیں۔ سردیوں میں آس پاس سے یعنی مری گجٹی علاقے کے لوگ یہاں مویشی چرانے کے لئے آ جاتے ہیں ایک آدھ جگہ کہیں پرانے قلعوں کے نشان اب بھی مل جاتے ہیں۔ میر معصوم صاحب نے تو صرف گرم ہوا کا ذکر کیا ہے یہاں ہم لوگوں پر جو بتی ہے یہیں ہی معلوم ہے۔ گرمیوں میں صبح نو بجے ہی سے درجہ حرارت ۱۲۴ ڈگری فارن ہائٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن واہرے ہلکے فوجی انجینئر۔ اس گرمی میں بھی شرک بناتے رہے۔ یہ بزرگ سب سے ماوند تک مکمل ہو چکی ہے۔

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں سیوستان سے ۱۳۸۱۹۳۰ درہم وصول ہوتے تھے اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر ۵۰۰ گھڑ سوار اور ۱۵۰ پیدل فوج بھی مہیا کرنی پڑتی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے دور حکومت تک اس علاقے میں مغلوں کا کافی زور رہا اور اس علاقے میں امن بھی برقرار رکھا گیا۔



اس دور کے بعد حالات کچھ زیادہ ہی ابتر ہونے شروع ہو گئے۔ ایک تو یہ علاقہ صوبہ ملتان کے تحت تھا اور پھر بالکل سلطنت کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے راستے بھی محدود، ملک میں بھی خلفشار ایسے میں یہاں کے قبائلیوں کو موقع ملا تو پھر لوٹ مار شروع ہو گئی اور آپس کے تھکڑے خوب رنگ لائے۔ اب تک یہاں پر بہت سی قومیں آباد ہو چکی تھیں۔ اس علاقے پر تسلط اب بھی پٹریوں کا تھا یعنی مرزاخان باروزی یہاں کے بدولت کے مالک، مگر ملتان صوبے کے تحت جب اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنے پوتے شہزادہ محمد معین الدین کو ملتان صوبے کا ناظم بنایا۔ سلطنت کو کمزور جانتے ہوئے ۱۷۷۰ء میں پٹریوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ اس بغاوت میں آگے آگے مرزاخان باروزی کے صاحبزادے بختیار خان تھے۔ شہزادہ معین الدین نے بغاوت کچلی اور بختیار خان مارے گئے۔ ۱۷۸۲ء میں شہزادہ معین الدین دہلی کے تخت پر بیٹھا اور جہاں دارشاہ لقب اختیار کیا۔ اپنی جدید محمد کھنور کو ناظم مقرر کیا اور نواب کے لقب سے نوازا۔ بعد میں یار محمد کھنور اخندیار خان عباسی کہلائے اس زمانے میں قلات پر برہیوں کا قبضہ تھا اور میر عبداللہ خان قلات کے خان تھے۔ ۱۷۸۱ء میں ناظم سے کچھ ان بن ہوئی۔ ان کے صاحبزادے نور محمد نے قلات پر چڑھائی کی ٹھانی اور عبدالستار خان اس معرکے میں کام آئے۔

### نادر شاہ کا قبضہ:

جب ملک میں خلفشار ہو تو باہر والے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ حملہ آور ہوا۔ ادھر اس علاقے میں افغان تفریق تھی۔ نادر شاہ نے دریائے سندھ سے مغرب کا حصہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ شہزادہ نور محمد کو گرفتار کر کے عبداللہ خان براہوی کے صاحبزادے محبت خان کے 'جو اس وقت قلات کے خان تھے' حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے مار کر اپنے باپ کا بدلہ لے۔ "محبت خان صحیح معنی میں بہادر تھے انہوں نے شیر خود شکار کرتا ہے۔ دوسرے کے مارے ہوئے کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ لہذا انہوں نے انکار کر دیا۔ اب معاملہ کیسے طے ہو۔ آخر طے پایا کہ خون بہا یا بجائے لہذا کچھ کا علاقہ جس میں سب سے بھی شامل تھا خون بہا کے طور پر قلات کے ساتھ ملا دیا گیا۔

## پیریوں کا دوبارہ قبضہ:

جب تک نادر شاہ جیات رہا معاملہ چلتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد پھر خلا پیدا ہوا۔ کوئی ایسا نہ تھا کہ علاقے کو قابو میں رکھتا۔ رکھنا بھی کیسے؟ علاقہ دشوار گزار اور لوگ بھی بغاوت پر آمادہ کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ کی موت کے بعد پیریوں نے اپنا علاقہ پھر سنبھال لیا۔ یعنی سبی اور آس پاس کے علاقے پر حکومت جمالی۔ درانیوں کا زور جو کم ہو چکا تھا، لہذا انہوں نے سبی بہتر سمجھا کہ باروزی مزاروں کو اپنے علاقے کا حاکم یعنی گورنر بنے دیا جائے تاکہ اثر بھی رہے۔ لیکن یہ حاکم بیچارے ہزنامی اور آج کل جو مری گئی کا علاقہ ہے وہاں اپنا اثر رکھنے میں قاصر رہے۔ کیونکہ یہ قبیلے کب حاکموں کے قابو میں آنے والے تھے۔

## فرنگیوں کا عہد:

۱۸۳۹ء میں سرنگی زور کافی بڑھ چکا تھا اور انھوں نے افغانستان پر چڑھائی بھی شروع کر دی تھی بگیرنوں کی تاریخ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو انہوں نے لڑائیوں سے کم اور سازشوں اور جوڑ توڑ سے زیادہ مالک کو حاصل کیلے یہاں بھی انہوں نے روباہ بازیوں سے کام لیا۔ ۱۸۳۹ء میں افغانستان پر فرنگیوں نے چڑھائی کی۔ اب درہ بولان کو فرنگی اپنے قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اس کے سامنے دورا ہی تھیں، یا تو اس پر لڑ کر قبضہ کیا جائے یا جوڑ توڑ سے اس نے آخر اند کر طریقے کو ترجیح دی۔ معری خان اس وقت پیریوں کا سردار تھا۔ شاہ شجاع سے کہا کہ اسے اپنے ساتھ ملو اور انگریزی دربار میں پیش کرو۔ معری خان کو کافی روپیے سے نوازا گیا اور پھر اس کے ساتھیوں سمیت ایک ملیٹیا بنا کر کھڑی کر دی۔ یعنی کالوں کو کالوں سے لڑوایا جائے۔ ہاں تھوڑی بہت مدد کی جائے گی۔ جب آپس میں لڑ کر کمزور ہو جاؤ گے تو قبضہ بھی جمائیں گے۔ شاہ شجاع اس علاقے کا مالک تو ضرور تھا۔ مگر اس کی مانتا کون تھا۔ کوئی بھی مال گزاری دینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے فرنگیوں سے مدد طلب کی۔ شروع میں تھوڑی تکلیف ہوئی مگر بعد میں سبی پر قبضہ کیا۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ گھر گرا دیے گئے۔ آس پاس کے علاقے کو آگ لگا دی گئی۔ سال بھر اس جگہ کو قبضے

میں رکھا۔ آخر طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ پھر ازراہ ہمدردی لوگوں کو اجازت دی کہ واپس آجاؤ اور گھر بناؤ مگر اس منظر پر کہ آئندہ گڑ بڑ نہ ہو اور سرکار برطانیہ کا نمائندہ یعنی پولیٹیکل ایجنٹ اس جگہ پر رہے گا۔ جب تک کہ سرکاری فوج افغانستان سے واپس نہیں آجاتی۔ افغانستان سے فوج کی واپسی پر علاقے کو خان آف قلات کے سپرد کیا گیا اور اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کو واپس بلایا گیا۔ ان تمام چال بازیوں سے انگریز کا مقصد یہ تھا کہ اپنا آمری اقتدار پر مضبوط کریں اور ضرورت پڑنے پر کابل سے واپسی میں تکلیف نہ ہو۔

سستی کی تاریخ کا سرسری جائزہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ دراصل بی کا علاقہ قمری قبائل کے بالکل متصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی یہ اس سلطنت کے ماتحت ہوتے تو کبھی آزاد۔ زیادہ تر آزادی رہتے کیونکہ اس علاقے پر قبضہ رکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پہاڑ ہیں، پانی کی کمیابی آنے جانے کے راستے محدود اور پھر لوگ آبائی جنگجو۔ یہ وجوہ تھیں کہ چند روز سے زائد اس علاقے پر کوئی قبضہ نہ رکھ سکتا تھا۔ آپ نے اندازہ لگایا ہو گا کہ صدیوں سے یہاں قومیں آتی جاتی رہی ہیں۔ کچھ یہیں کی ہو کر رہ گئیں پہلے ہندو یہاں تھے، پھر عرب آئے۔ منغل ارغون یعنی ترک۔ پٹنری۔ درانی اور پھر انگریز۔ اس پس منظر کے بعد اب ہم بلوچ قبائل کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔







دو نفیس سیرتوری مجوهرات در شایسته و افضل مقیم خال و ادنی گریزی میباید زیر تیر کفران و یکده رسیده



## بلوچ قبائل

### بلوچوں کا نسب:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آج کل کے بلوچ قبائل آئے کہاں سے اور کب اس علاقے میں آباد ہوئے۔ اس پر کافی تحقیق ہو چکی ہے۔ ریسرچ پر ریسرچ کرنا مشکل کام ہے اور میرے لئے تو ناممکن مگر چلئے کوشش کئے لیتا ہوں۔

پرائی بلوچی روایت اور ادب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ بلوچ حضرت امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں۔ اب اس میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی اس کو کہانی سے تعبیر کرتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس میں کتنی کہانی ہے اور کتنی حقیقت! یہ فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

ایک اور ادبی روایت کے مطابق حضرت امیر حمزہؓ شکار پر گئے تھے کہ راستے میں ایک پری سے ملاقات ہوئی اور اس سے عقد ہو گیا۔ پری کے بطن سے بڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبدالرحمن رکھا گیا۔ ان سے آبان پیدا ہوئے پھر اولاد کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ محمد بن ہارون پیدا ہوئے جو

محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ کی ہم پر تشریف لائے اور انہوں نے سات شادیاں کیں جس سے ماشاء اللہ پچاس اولادیں پیدا ہوئیں اور وہ یہیں کے ہو رہے۔

پرائی ادبی شاعری کی حد تک یہ کہانی، کہانی ہی ہے۔ کیونکہ بعد میں لوگوں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ حضرت امیر حمزہؑ کے تمام صاحبزادے عین عالم شباب میں فی سبیل اللہ لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے اس لئے اولادِ مزینہ کا سوال مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس روایت کی حمایت میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ایک روایت جو پشتہ پاشت سے چلی آرہی ہے ایسی آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ آج کل کے زمانے میں پریوں کے وجود کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بعید از قیاس نہیں کہ حضرت امیر حمزہؑ عراق اور شام کے سفر پر گئے ہوں اور وہاں انہوں نے شادی کی ہو۔ اس بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ وہ وہاں گئے ہیں اور انہوں نے وہاں شادی کی ہے تو وہاں کی عورتیں مثالی خوبصورتی کے باعث پری کہلاتی تھیں۔ انہی کی اولاد سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔

### لفظ بلوچ کی تحقیق:

اب ایک نظریہ جو عام ہے وہ یہ ہے کہ لفظ "بلوچ" دراصل پرانا لفظ نہیں ہے۔ اس میں لفظ کی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور موجودہ لفظ حال کی اشتراک ہے۔ قدیم کوش رسم الخط "بلوٹ" یا "بیلوٹ" تھا، اسیرا، بابل اور کلدانی موزین نے اپنی تحریروں میں "بیلوس" یا "بلوس" لکھا ہے۔ قرون وسطیٰ کے عربوں نے "بلوس" "بلوچ" اور اہل فارس نے اسے "بلوچ" سے موسوم کیا ہے۔

بلوچ کوش خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کا مورث اعلیٰ بلوس تھا جسے نمرود بھی کہتے ہیں۔  
 رملاحظہ کیجئے میر سردار خان کشکوری "HISTORY OF BALUCH RACE"۔ ہسٹری آف بلوچ ریس)۔

ایک صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بلوچ قوم بلوس بن الکاوس شاہ بابل کی اولادیں۔ اور بلوچ ۴۸۵ قبل مسیح میں موجود تھے۔ اس کا پتا لگانے کے لئے انہیں ساہا سال کاوش کرنی پڑی۔ میر گل خان نصیر جنہیں بلوچی تاریخ پر کافی عبور ہے اپنی کتاب "تاریخ بلوچستان" میں لکھتے

ہیں۔ یہ بلوچ قوم زمانہ قدیم میں عربستان میں دجلہ اور فرات کی گودیوں اور حلب کے مرغزاروں میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھی اور ایران میں تبریز کے کوہ البرز کے دامن میں مشہد تک پھیلی ہوئی تھی۔

ابو القاسم فردوسی نے بھی اپنی مشہور تصنیف ”شاهنامہ“ میں بلوچوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ داستان کم و بیش ۳۸۷۲ سال پرانی چلی ایرانی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ ذکر کیساؤس کی فوج کے بارے میں ہے چند مؤرخین نے اس کو کینسر و لکھا ہے۔ اس کا دور حکومت ۵۳۵ سے ۵۵۸ قبل مسیح بتایا جاتا ہے فردوسی ان کی بہادری کے بارے میں لکھتا ہے۔

سپاہی زگردان کوخ و بلوچ سگاندہ جنگ مانند قوچ

کہ کس در زبیاں پشت ایشان نہ برہنیک انگشت ایشان ندید

سپہ دارشان اشکش تیرہش کیا دئے دل بود باندہ خوش

درفتنے بر آوردہ پیکر پنگ ہمے از درفشش بازید چنگ

یعنی یہ لوگ اتنے بہادر تھے کہ دنیا میں اپنی مثال نہ رکھتے جنگ سے منہ نہ موڑتے اور جنگ میں کوئی ان کی پیٹھ نہ دیکھتا۔ انہوں نے جوشن۔ زرہ اور خود سے اپنے آپ کو اس طرح مزین کر رکھا تھا کہ ان کی انگلی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی، ان کا اپنا جھنڈا تھا جس پر چیتا بنا ہوا تھا۔

ہنری آف ورلڈ (HISTORY OF THE WORLD) جسے ہنری اسمتھ ولیم (HENRY SMITH WILLIAM) نے مرتب کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ شاہ ایران زکس، جو کہ

۲۶۵ سے ۲۸۵ قبل مسیح میں فرمانروا تھا، اس نے جب یورپ پر حملے کی ٹھانی تو اپنی فوج کا جائزہ لیا۔ یہ فوج ۵۶ قوموں پر مشتمل تھی جن میں بلوچ بھی شامل تھے۔ یہ حوالہ ہنری اسمتھ نے مشہور

یونانی مؤرخ ہیورڈوٹس کی تاریخ سے دیا ہے اب جب حسب و نسب کی بات چل نکلی ہے تو رائے سٹالامتورام صاحب سی۔ آئی۔ ای کی کتاب ”تاریخ بلوچستان“ پر نظر ڈالتے ہیں۔ رائے صاحب کی یہ کتاب

۱۹۷۷ء میں چھپی تھی اور بلوچ تاریخ پر کافی مستند مانی جاتی ہے۔ بقول لالہ صاحب کے انہوں نے ساری



عمر بادۂ پیمائی کی اور نوکری کے دوران بلوچستان کا کوئی بھی کونہ نہیں چھوڑا اور لوگوں سے مل جل کر اور کتابیں پڑھ پڑھ کر روایات اکٹھا کرتے رہے، اس دقت و کاوش سے انہوں نے کتاب مرتب کی۔ لالہ صاحب بلوچ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ حلی زبان میں بلوچ بادیہ نشین کو کہتے ہیں جو لوگ ہمیشہ صحرا اور دامن کوہستان میں خانہ بدوش رہنے والے ہوں ان کو بلوچ کہا جاتا ہے (جیسے پونہ افغانی زبان میں مردم بادیہ نشین کو کہتے ہیں) یہ لفظ کسی قوم سے متعلق نہ تھا بہت مختلف قوموں پر یہ لفظ مستعمل ہوتا رہا۔ اب بھی چند قومیں اس بلوچستان میں ایسی رہتی ہیں جن کا نسب نامہ ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن تمام قوم بلوچ کہلاتے ہیں۔ ماسوائے رند اور لاشاری کے۔ براہوی۔ وودائی۔ نوشیروانی۔ لکی یہ بھی بلوچ کہلاتے ہیں حالانکہ ان کا نسب نامہ رند اور لاشاری سے بالکل جدا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم پیشہ و ہم وطن ہونے کے باعث ان کو بلوچ نام دیا گیا ورنہ وہ بالکل خاندان بلوچ سے الگ ہیں۔ اسی طرح گیلانی وایلڈی و کردگی بلوچ کہلاتے ہیں اور فردوسی نے اپنی تصنیف شہنامہ میں اس قسم کی جملہ اقوام کو بلوچی نام دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بلوچ لوگ امایین کے مرید تھے اور جب فیما بین امایین اور یزید میں لڑائی ہوئی جس میں امایین شہید ہوئے تو بلوچ لوگ امایین کے طرف دار تھے اور یزید کے خوف سے صوب سے کوچ کر کے اس طرف آئے۔“

لالہ صاحب نے اپنی اس تحقیق کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک پرانی بلوچی نظم درج کی ہے بقول ان کے یہ سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے لیکن اب تو سینہ بہ سینہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا کیونکہ لالہ صاحب نے تو یہ نظم چھپوا دی۔ ویسے شاید لالہ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ ان کے ایک انگریز اعلیٰ افسر جن کے ساتھ وہ کام کرتے رہے تھے یعنی مسٹر ایم۔ ایل ڈیکس (Mr. M. L. DAMES) نے اس نظم کے ساتھ ۱۹۰۷ء میں ایک بلوچی نظموں کا مجموعہ پاپولر پوسٹری آف دی بلوچستان (POPULAR POETRY OF THE BALUCHISTAN) کے نام سے انگلستان میں چھپوایا تھا اس کی کاپی ابھی تک برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ چلئے ہم بھی اس نظم کو مجنسہ ترجمہ کے ساتھ

ذیل میں درج کرتے ہیں۔

شکر الحمد للہ گزاران بادشاہ ملک اوشاں  
یہ وٹ، کھنٹی س ملک کل جہاں خاک و گل  
اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ جو ملک کا بادشاہ ہے۔  
ایک ہی ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا آخر تمام جہاں خاک  
اور گل ہوگا۔

مامرید اول علی، دین و ایمان ثبت ہیں  
ہم لوگ (بلوچ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مرید ہیں دین ایمان  
ہمارا ثابت ہے۔

حمزہ ذوالاولاد بلوچ اس سو بڑا گاہ، گورایں  
ان کو فتح نصیب ہے۔  
بلوچ امیر حمزہ کی اولاد ہیں اور درگاہ الہی سے

انہیں پہچان کیوں گویں، بیٹرواں  
کلبلا بھیمو ریام، شہر سیستان منزل ہیں  
ہم حلب سے آئے (جبکہ) یزید سے ہماری جنگ ہے۔  
ہم نے کر بلا اور کمپور کے درمیان علاقہ سیستان میں  
قیام کیا۔

میں میری جلالاں چل و چلیں بولک  
کھانڈٹوں ہارین بند کچ، رانیس پلوایں  
جب حلب سے روانہ ہوئے بڑا سردار بلوچوں کا میر  
جلالاں تھا اور چوالیس فرقے بلوچی کے تھے۔  
وہاں سے ہارین بند میں جو جانب راست ملک کچ  
کے ہے۔

سیم و جواں بہر کھانا، کل و سردار شیک ہیں  
آپس میں تقسیم کرتے آئے اس وقت سردار کل قوم  
ملک اور جو بائے آب بلوچوں کے ہاتھ میں آئے  
آپس میں تقسیم کرتے آئے اس وقت سردار کل قوم  
کا میر شہلک تھا۔

مکران، ہوت نندی کھوٹ من کچ، دہاں  
دیسہ جب چاندیہ سینگ ایں کلمتی لوغ پہ گورایں  
ملک مکران میں ہوت بلوچ اور کھوسہ علاقہ کچ میں  
جب میں چاندیہ اور کلمتی اس کے آس پاس  
اور ملی میں نوحانی بلوچ اور جٹکانی اس کے قریب تھے

مستریں بلوغ ڈوبکی، گاج سیاہ آف سراپ  
ڈوبکی کا بڑا گھرانہ گاج اور سیاہ آف کے اوپر پرمیر  
عالی جنونی تمام علاقہ ڈھادر میں۔

گولو دگو پانگ و دشتی زندہ تھالی و درایں  
تھی بلوچ بازو پشایں درست زندہ منہدایں  
اور کچی بلوچ بہت ہیں جو تمام زندہ کے ساتھ  
شامل ہیں۔

نوح و دودائی اواریں اے گوں لاشاریہ برایں  
زندہ لاشاری میں ملک پھوٹ و سیاہ درایں  
زندہ من سوران و مندی لاشارین گنداونہ  
پیلیں سی سال جنگیں اے بلوچی شدت این  
شہک و شہد اور زندہ مس و سردار چاکریں  
چل ہزار رکھے میر و گوانکھ و تھینا ڈاڈے پوترو  
نوسانی دودائی لاشاری کے ساتھ شامل ہوئے ہیں  
زندہ اور لاشاری کا ملک ایک دوسرے سے متصل ہے  
زندہ شوران میں مٹییا اور لاشاری گنداونہ میں  
پورے تیس سال آپس میں جنگ کی یہ بلوچوں کی ضد  
شہک اور شہداد کے بعد تمام قوم کا سردار میر چاکر تھا  
چہل ہزار لشکر میر چاکر کے بلنے پر تمام ایک خاندان  
سے حاضر ہوتے تھے۔

ہول پوش روز کلاہ و وزکوان و جاہ این  
بعضے خود پوش اور بعضے ہاتھ میں دستانے پہنے محئے  
بعض کمان اور ترکش کمان خوب سبھی ہوئی۔  
بعض کمان و ترکش سے لیس۔ ابریشمی قبائیں اور  
پاؤں میں سرخ موزے پہنے ہوئے۔

نچڑاں جائو و جوبابیں بندہ و برادر این  
جائو از قوم پشاور بہادر تھا۔ بندہ اس کا دینی  
بھائی تھا۔

پیروز شہنہ بجاز ریحان زندہ میران زہم جن این  
پیروز شاہ بجاز ریحان، میران، میزان از قوم زندہ مشہور  
شمسیر زن تھے۔

ہیبتاں یورغ مس زندہ میر حسن و براہم بھی زندہ تھے۔  
صوبہ عالی و میہال جام سہاک و ملنڈ این  
صوبہ عالی میہال جام سہاک ملنڈ این بھی تھے۔

شاعر کہ شیران، جوڑان میر جلالاں منصفیاس شاعر لوگ جو شعر کہتے ہیں گویا کہ جہان کے گلشن میں نہال لگاتے ہیں۔

لے مئی پیر اور ندایں الے بلوچی و پترایں یہ بلوچوں کا نسب نامہ اور توازنِ سخن ہے۔

ذکر چونکہ تاریخ کا ہو رہا ہے۔ ہم نے اجمالی یہاں تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ امر بہت مشکل ہے کہ ہم یہ فیصلہ دیں کہ ان میں کون سی بات سچ ہے اور کون سی غلط، ہم اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ دراصل ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس علاقے میں بھی آپ جائیں اور خاص طور سے فوجی آدمی کے لئے اس علاقے کی تاریخ سے تھوڑا بہت واقف ہونا ضروری ہے۔ اس طرح عملی کارروائی میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ تو اپنا منکب ہے۔ ہم اپنے بارے میں نہیں جانتے تھے تو اور کون جانے گا۔

تحقیق و تلاش اور جستجو کا یہ شوق بیرونی ممالک کے ریسرچ اسکالروں کو بہت زیادہ ہے چنانچہ بلوچ ۱۹۵۵ء میں ایک امریکن مسٹر این فرسن (MR. N. PHERSON) نے اپنی ٹیم کے مری علاقے میں تشریف لائے۔ یہ

اینٹروپولوجسٹ (ANTHROPOLOGIST) تھے یعنی "عالم انسانیت"۔ میرے خیال میں اس عالم

انسانیت کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے: "عالم انسانیت" سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک علاقے کے

رہنے والوں کا فعلیاتی اور نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ ویسے یہ مضمون ہماری یونیورسٹیوں میں بھی پڑھایا

جاتا ہے۔ وہ ہمارے بھائیوں کے ساتھ رہے ان کی زبان سیکھی اور پھر ان کا یہیں ۸ ستمبر ۱۹۵۵ء میں

انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے ایک ساتھی فریڈریک بارتھ (FREDRIK BARTH) صاحب

پہنچے۔ اور انہوں نے مرحوم کی بیگم صاحبہ کے ساتھ مل کر کام مکمل کر کے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام

"دی سوشل آرگنائزیشن آف دی ماٹری بلوچ (THE SOCIAL ORGANISATION OF

MARI BALUCH) ہے یہ کتاب کافی مستند مانا جاتی ہے۔ ہمارے اسکالر جابجا اس کتاب کا

حوالہ دیتے ہیں۔ ان کی اس تحقیقی کتاب کو دیکھ کر ان کی بہت اور اولوالعزمی کی داد دینی پڑتی ہے

اس کے علاوہ مصنف مذکور اس سے قبل "لیپ لینڈ" (LAP LAND) میں بھی اس قسم کا کام

کر چکے تھے۔



## تاریخ سے واقفیت کا اصل مقصد :

تاریخ سے واقفیت کا اصل مقصد یہ ہے کہ آج کل کے حالات کا تعلق ماضی سے بھی ہوتا ہے، کوئی بھی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کے سارے حصے یا یوں پھر کہہ لیجئے کہ ”صوبے“ میں نہ ہوں۔ جہاں پاکستان کے ترقی یافتہ علاقے ”حال“ میں ہیں تو یہاں ابھی تک ماضی موجود ہے۔ اب باقی دنیا کے حالات سے حساب لگائیے تو یہ پتہ چلے گا کہ ترقی یافتہ قومیں اگر ”حال“ میں ہیں تو ہم ابھی ”ماضی“ میں ہیں حال اور ماضی کے خلا کو پہلے ملکی سطح پر دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خلا دور کر کے ہم پھر یہ جدوجہد کر سکتے ہیں کہ اپنے ملکی اور ترقی یافتہ قوموں کے خلا کو دور کر کے ”حال“ میں داخل ہو جائیں ملکی سطح پر اگر یہ خلا دور نہ ہوا تو جناب بات نہیں بنتی۔ ملک کا کچھ حصہ ترقی یافتہ اور باقی سترھویں صدی میں تو سترھویں صدی والا تو آپ کو پیچھے گھسیٹے گا۔ وہ تو اس ذہنیت میں سوچے گا کہ اس دور میں وہ ہو۔ آج کل دنیا بہت چھوٹی ہے۔ دشمن ہاک میں ہمیشہ سے ہے اور رہے گا۔ سترھویں صدی والے کو اسیا اور آپ کی ترقی کو تنزل کی طرف مائل کر دیا۔ یہ تو ہوتا آیا ہے آپ نے خود دیکھ لیا۔

فلسفہ کو چھوڑیے بات تاریخ کی تھی اور وہ بھی لالہ تحور رام کی کتاب ”تاریخ بلوچستان“ کے متعلق۔ اب تک ہم نے آپ کو مختلف کتابوں کے حوالے دے کر یہ کوشش کی کہ ایک قسم کا تاریخی منظر علاقے کے بارے میں قائم ہو جائے۔ لیکن لالہ صاحب نے دریا کو کوزے میں سمونے کی کوشش کی ہے تو آپ بھی سن لیں۔

جو لوگ علم تاریخ سے واقف ہیں وہ انکار نہیں کریں گے کہ زمانہ قدیم میں یہ ملک بلوچستان بلکہ افغانستان بھی ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ ”مہا بھارت“ میں جو ایک قدیم تواریخ ہندوؤں کی ہے صاف طور پر لکھا ہے کہ راجہ سیپال چچم دیس کا یعنی مغربی حصہ ہندوستان کا چند بار کرشن ہماراج سے آکر لڑائی کرتا رہا اور جب فیما بین پاٹو کر و جس کو پانچ ہزار برس سے بھی اوپر عمر گزر چکا ہے بڑی سخت جنگ ہوتی تھی۔ اس وقت شکستی نام راجا قندھار کا جو راجا تھرا شٹر کیر و کا شٹر و

تھا۔ کیر و لوگوں کی طرف تھا بلکہ اس کی دختر کا نام جو راجہ تھرا شتر سے بیاہی ہوئی تھی دیو گندھاری تھا۔  
 قندھار کا نام ہندو کتابوں میں گندھار لکھا ہوا ہے جس کے معنی خوشبودار کے ہیں ایرانی لوگ بھی اب  
 تک قندھار کو گندھار استمال کرتے ہیں۔ سیوانامی ایک مشہور راجا اس ملک کا ہوا ہے۔ شہر سیوی بھی  
 اسی نے آباد کیا تھا۔ اس لئے اس کا نام سیوی شہر ہوا۔ ایک دی پرانا نام صلا آتا ہے جبکہ بلوچ لوگ اس ملک  
 میں آباد ہوئے۔ اس سے پہلے پرانی کتابوں میں سیوستان مشہور تھا۔ قلات میں اب تک ایک فرقہ موجود  
 ہے جو سیواڑی کہلاتا ہے۔ یہ اسی سیوا کے خاندان سے ہے۔ یہ لوگ ہندو تھے مگر اب مسلمان ہیں اور ان  
 کی تین زیارتیں عرصہ قدیم سے اس ملک میں چلی آرہی ہیں۔ مثلاً قلات میں کالی دیوی مستونگ میں  
 مہادیو اور شال میں سمادھ جوگی پانی ناتھ اور ان کی تینوں زیارتوں کے متعلق ہندی میں ایک شعر بھی  
 ہے۔ کالی دے قلات میں مہادیو مستونگ بڑھتر جوگی شال میں پانی ناتھ بلونت  
 معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قلات کو سیواڑی ہندو لوگوں کے ہاتھ سے اقوام مغل نے لیا۔  
 کتب قدیم سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پہلے مغلوں کا بڑا زور تھا۔ نادر شاہی ہم مغل طاقت میں  
 آئے۔ بعد اس کے ان کا زور ٹوٹا اور افغان نے زور کھڑا۔ افغانوں کے بعد قندھار بڑھیسوں کے  
 ہاتھ آیا اور بلوچوں نے زور دکھایا۔ اس کے بعد انگریز مسلط ہے۔ یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ گزشتہ  
 اوراق میں بلوچوں کی غم دہی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچوں کو مان سے کوچ کر کے کچ اور مکران میں  
 آئے۔ اس وقت سامے بلوچوں کا سردار میر جلال یعنی جلال خان تھا اس وقت ان کے چوایس  
 فرقے شمار کیے جلتے تھے۔ فرقہ عجیب چیز ہے ہر دار بدلتے جاتے ہیں ان کی اولاد کے نام سے نئے فرقے  
 بنتے جاتے ہیں۔ انگریز کے گزیٹیر (GAZETTEER) میں مریوں کے فرقے دیئے گئے ہیں۔ یہ فرقے اس  
 سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ وڈیرہ بھی اپنی اولاد کے نام سے فرقہ شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ہم  
 جلال خان کے متعلق عرض کرتے ہیں۔ جلال خان کے پانچ بیٹے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ بیٹے  
 فرقے لوگوں کے نام سے رائج ہوئے یعنی رند، لشاری، کوارائی، جتوی، صوت۔ باقی چوایس  
 فرقے بھی انہی پانچ فرقوں میں مدغم ہو گئے۔ وہ تو ہوتا تھا۔ کیونکہ سوسائٹی اسی قسم کی تھی۔ بچا و سردار

ہی مہیا کرتا تھا اور سردار کی طاقت فرقے کی نفی پر منحصر ہوتی ہے۔ جتنا طاقتور سردار ہوا اتنے ہی لوگ اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان پانچ فرقوں میں سب سے مضبوط و مشہور ہوئے یعنی رند اور لاشاری جتوی بھی رند کے ساتھ مل گئے۔ کورائی کچھ رند اور کچھ لاشاری سے مل گئے اس کے بعد ان سب نے مل کر مکران قلات کا کچھ حصہ کبھی اور سب پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ لنگھاؤں کا برہانامہ سب سے اور کبھی پر اثر تھا تقریباً تیس سال تک ان فرقوں میں بڑی دوستی رہی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ آخر حسب و نسب ملتا تھا۔ اس کے بعد آپس کی تیس سالہ جنگ چھڑی جس کا ذکر آئندہ اوراق میں کیا جائیگا۔







حق کی ایک تصویر۔ جو نزدیک سے آتا رہی گئی



## تیسرے سالہ جنگ

اب بلوچوں کی ایک سلطنت سی بن چکی تھی۔ قلات و مکران کا کچھ حصہ بنی کچھی کا علاقہ اور آج کل مری گئی ایجنسی۔ یہ تمام علاقہ ان کے زیر اثر تھا۔ یہ واقعہ پندرھویں صدی کے آخر و دریاہ صدی کے شروع کا ہے۔

نندا کا کرنا ایسا ہوا کہ سردار رند "شہک" کے بیٹے "میر چاکر" اور سردار لاشاری "گواہرام" کے بیٹے "رامن" میں گھوڑا دوڑانے کی شرط لگی یہ طے ہوا کہ "رامن لاشاری کی گھوڑی" مہمل اور ریحان رند جو کہ میر چاکر کے بھائی تھے ان کی گھوڑی "سیاہ مزار" اس دوڑ میں حصہ لیں گی۔ دوڑ کے بعد یہ فیصلہ ہو سکا کہ کون جیتا کیونکہ دونوں فریقین اس پر بند تھے کہ ہم جیتے۔ کچھ نے فیصلہ دیا کہ میر چاکر شرط جیتے ہیں اس کا رامن کو بہت قلق ہوا۔ قلق تو ہونا ہی تھا کیونکہ شرط ہی جیتنے کے لئے لگائی جاتی ہے۔ پھر یہ معاملہ قبیلے کی عزت کا بھی تھا۔ عزت ایسی آسانی سے گنوائی نہیں جاسکتی اب کیا کیا جائے۔ رندوں سے بدلہ لینا واجب۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عورت سمات "گوہر جتنی" میر چاکر کی پناہ میں

تھی۔ اس کے اونٹوں کو لاشاریوں نے رامن کی ہایت پر ذبح کر دیا اور غارت کیا۔ مسلت گوہر جتنی  
فریاد لے کر میر چاکر کے پاس پہنچی۔ اس کا منظر ایک بلوچی نظم میں خوب بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کے  
کچھ حصے کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

جہاں جت چاکر کے پاس جا کر روئے۔	بانگہی جت گوی چاکر ۷ گمرینت
دیکھو کہ رامن نے ایسی کی دشمنی	گنہ کہ رامن ۷ چھوں کشتہ غیری
گوہر کے شتر پچے کو کاٹ دیا پرسوں	گوہر ۷ ہرے گدشتہ پھیری
بے گناہ امن پسندوں کو رلیا	بے گناہی ۷ گریٹھفال غیری
گوہر یا دھتھی رندا لاشاری کی	گوہرات باہوٹ رندا لاشاری
دندوں قوموں کے درمیان مال چراتی تھی	بردو راجانی نیامخ ۷ چاری
زیادہ تر میر چاکر کے پاس رہتی تھی	گیشتریں کھرس چاکر ۷ دانین
وہ بڑا شیر تھا اور عزت والا تھا۔	آن مزن بھونڑیں و امہرائیں
فریاد کی اس نے ہاتھ اونچے کر کے۔	دانشی ۷ امنہ گوں بڑنیں دستان
گوہر کے بچہ شتر کے مارے جانے کے بدلے	گوہر ہر راجہ دھکے
ہم لائیں گے لاکھوں اسپ میدان میں	من گدرو لان گاہشہ لکھے
آجوتیس برس تک کریں جھگڑا	بیات ماسی سال ڈیوں بکھے
اس بات پر ہنگامہ بپا ہو گیا۔	اش ہے کالاں بل کھڑو بیشہ
رندا لاشاری جنگ شروع ہو گئی	رندا لاشار ۷ جنگ کھڑو بیشہ

یہ تو خیر بہت بڑی بات تھی کہ کسی کو پناہ دی گئی ہو اور وہ بھی عورت کو اور اسے تنگ کیا جائے  
بلوچی غیرت کا پناہ کے معاملے میں ایک نظم سے اندازہ لگا سکتے ہیں جو ترجمے کے ساتھ ذیل میں درج ہے:

شاہ حسین ۷ چہرہ ۷ روشن ۷	ایک دفعہ امام حسین کے ماتم کے دنوں میں
درکھنی بانارے اٹھ ۷ گیدو ۷	جھاڑی میں سے ایک گرگٹ نکلا۔

چھوڑاں انعام بوختہ پہ دیم  
گرگھناں، دواں مہتر، لونخ  
نیت آمن لونخ، ستوی سالوخ  
ورکھنی دیم، مڑے جوائیں  
بیسری گال آختہ مزین شاخیں  
قیانہی منت اش کشی، یازیں

”چھوڑاں پے لے منی را بسجایں“  
بچ نہ ویش پہ منتاں جٹاں  
چھوڑاں باغ کشتہ پہ لٹاں  
جلد کھوڑی، بھجیشتی وانہیں  
”تھوپہ باغ، اغ نہ کھٹ کائی  
من تھی بھینر و تھومنی بھائی“

لڑکوں نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا  
اور دوڑتے ہوئے مقدم کے گھر تک آئے۔  
اس وقت صاحب خانہ گھر میں موجود نہیں تھا۔  
گھر کی نیک سیرت مالکہ باہر آئی اور  
پُرفار خاتون مخاطب ہوئی  
اس نے صدمے بڑھ کر منت سماجت کی۔

اور کہا: ”بچو! اسے چھوڑ دو یہ میری پناہ میں آ گیا ہے“  
”لیکن“ گنوار تچوں پہ منت سماجت کا کوئی اثر نہ ہوا۔  
اور لڑکوں نے گرگٹ کو لاکھوں سے مار ڈالا  
عورت نے فوراً خاندان کے پاس فریادیں پجائی  
”اگر تو نے گرگٹ کا بدلہ نہ لیا  
(تو پھر) مجھے اس کے بعد اپنی بہن سمجھو اور میں تجھے اپنا  
بھائی سمجھوں گی۔“

(خاندان نے کہا) اے ماہ روز: تو مجھ سے ایسی بات کہہ  
تو میری بیوی اور میں تیرا خاندان ہوں۔  
میں گرگٹ کا بدلہ یوں لے کر دکھاؤں گا۔  
کہ زمین خون سے لالہ زار بن جائے گی۔  
(چنانچہ) ایک جانب سے ساٹھ اور دوسری جانب سے  
پچاس یہ سب کے سب گرگٹ کی نذر ہو گئے

تو یہ قسم تھا ایک عورت کا جس نے ایک گرگٹ کو پناہ دی تھی۔ ذکر ہو رہا تھا رندوں اور لاشیوں  
کی جنگ کا یہ ستلہ مکے اوائل کی بات ہے اس وقت رندوں کا قفسہ سب کبھی قلات کا پہاڑی حصہ اور

اواس ماہین، کال میاگوما  
تھومنی زال و من تھی جوداں  
میں پھر آیا غار، کھناں پھوں  
کہ لے ڈغار شہمی بیٹ ازخوں  
شنگر شمت و شانگر، پناہ  
درہ پہ باغ، بشیخاں یک جاہ



آج کل کے مری علاقے پر تھا۔ ویسے یہ علاقہ ملتان موہے کا حصہ گنا جاتا تھا۔ ملتان پر لنگھاؤں کی حکومت تھی۔ لاشاریوں نے لنگھاؤں سے مدد طلب کی اور سبھی پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبضہ تھوڑے ہی عرصے رہا۔ جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے مغلوں نے کوئٹہ پشین اور سبی کا علاقہ امیر ذوالنون کو ان کی خدمات کے سلسلے میں دیا تھا۔ لہذا امیر ذوالنون کے بیٹے شاہ بیگ ارغون نے سبی پر چڑھائی کی ٹھانی میر جاگیر بھی ارغونوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ زبردست جنگ کے بعد سبی فتح کر لیا لکھا جاتا ہے کہ جنگ سے پہلے ارغونوں نے وعدہ کیا تھا کہ سبی کا علاقہ میر جاگیر یعنی رندوں کو واپس کر دیا جائے گا۔ اب بلوچ اپنی ہی اتفاق سے کمزور ہو چکے تھے اور نرگوں کا ارادہ بھی بدل چکا تھا۔ میر جاگیر نے رات کی تاریکی میں سبی کو خیر باد کہا مگر نرگوں نے پھر بھی پیچھا کیا۔ میر جاگیر مہوند اور نداری کے علاقہ میں آ کر ٹھہرے۔ یہاں پر روایات میں معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ یہاں نرگوں سے جنگ کر کے پنجاب چلے گئے اور بعض کا کہنا ہے کہ جب ہالیوں واپس دہلی گیا تو اس کے ساتھ گئے۔ اس کا ذکر وضاحت سے آگے کیا جائے گا۔ لاشاریوں کے سردار گنہ گم پر کیا جیتی۔ جب سبی پر لنگھاؤں کو شکست ہوئی تو شاہ بیگ نے چیمپان چھوڑا۔ گوہرام شاہی یہاں سے گجرات چلے گئے اور آج تک کسی کو ان کی قبر کا پتہ نہیں۔ یہ بددعا میر جاگیر نے ان کو دی تھی کہ تیری قبر کا پتہ تک نہیں چلے گا۔

یہ تیس سالہ لڑائی تو ہم نے بڑے مختصر طور پر بیان کی ہے۔ اگر آپ یہاں کی تفصیلات سنیں تو پتہ لگتا ہے کہ کتنی بہادری رندوں اور لاشاریوں نے دکھائی اور کیا کیا معرکے سرکے۔ سب کے معرکے کے بعد لاشاری شکست کھا کر بکھر گئے۔ کچھ دیر غازی خان کی سرحد پر رہے اور کچھ نے ڈیرہ اسماعیل خان میں پناہ لی۔ کچھ نے جھلوان کا رُح کیا اور براہویوں کے ساتھ رہنے لگے۔ کچھ چلتے چلتے سندھ اور کاتیاواڑ تک پہنچ گئے۔

میر جاگیر کا نام بلوچ اب بھی بڑی عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔ کچھ اسے ولی کا رتبہ دیتے ہیں اور کچھ اسے بے حد عقلمند اور بہادر جنرل گردانتے ہیں۔ روایت ہے کہ میر جاگیر کا ایک بہت اچھا دوست شاہ مرید تھا۔ دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ شکار کھیلتے کھیلتے دور تک نکل گئے۔ سخت پیاس لگی تو دونوں

ایک خیمے کے قریب پہنچے۔ وہاں دو لڑکیاں ملیں ان سے پانی مانگا۔ لڑکیاں پانی لے آئیں میر جاگر کچلے جو پانی لائی تو اس میں کافی گھاس پھوس پڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ پانی تیزی سے نہ پی سکا اور کم کھی پیا۔ دوست کے لیے جو پانی لائی وہ صاف اور ٹھنڈا تھا۔ لہذا شاہ مرید نے خوب پیا۔ اب گرمی میں جو وہاں لوٹے تو شاہ مرید تھوڑی دور چل کر بیمار ہو گئے۔ اس قصبے سے میر جاگر تارگئے کہ لڑکی جس نے انھیں پانی پلایا تھا، بید عقلمند تھی کیونکہ اس نے جان بوجھ کر اس طرح پانی دیا تھا کہ وہ زیادہ پانی نہ پی سکیں۔ لامحالہ کسی سے محبت ہو سکتی ہے کہ ایک لڑکی جو ان لڑکے کے ساتھ ایسی حرکت کرتی ہے بعد میں یہ پتا چلا کہ جس لڑکی نے میر جاگر کو پانی پلایا تھا وہ دوست کی منگینہ تھی مگر میر جاگر دل دے چکے تھے لڑکی کی خوبصورتی اور اس کی عقلمندی۔ دل کا معاملہ سنگین ہوتا ہے اور پھر وہ بھی دوست کے حق پر کیا کیا جائے کوئی صورت تو بہر حال نکالنی تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو، زبردست جشن منایا گیا، شوب سبھی بنی۔ کھیل تماشے ہوئے۔ جب سب بید خوشی کے موڑ میں ہو گئے تو میر جاگر نے اعلان کیا کہ آج اس خوشی کے موقع پر سب کو اجازت ہے کہ جو کچھ مانگے گا وہ پائے گا۔ سب نے اقرار کیا اور حامی بھر لی۔ جو بھی جس کے جی میں آیا اس نے مانگا اور پیا۔ آخر میں میر جاگر کا نمبر آیا تو انھوں نے شاہ مرید سے مخاطب ہو کر کہا ”مجھے اپنی منگینہ دے دو“ اب سچا رہ زبان دے چکا تھا انکار کیسے کرتا اور وہ بھی بلوچی وعدہ۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ وعدہ وفائی کی ضد ہوتی ہے۔ وعدہ نبھایا اور ایسا نبھایا کہ لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ وعدہ وفا کر کے فیکری لے لی اور جنگل کا رخ کیا کہتے ہیں کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور ان پہاڑوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔

میر جاگر کی زوجہ کا نام بی بی بانی تھا۔ ان کی عقلمندی کی بیشمار داستانیں مشہور ہیں، ایک تو پانی پلانے والی آپ نے سُن لی، اب ایک اور سُن لیں۔ سبکی کی جانب سے اگر آپ میوند کی طرف جائیں تو ایک سنگی پڑتی ہے۔ اس کا نام چاکر سنگی مشہور ہے۔ ہم بھی وہاں کئی دفعہ گئے۔ اس سنگی کی اونچائی تقریباً ۱۰ فٹ ہے۔ یہاں فوجی انجینئروں کو سڑک بنانے میں نامی وقت ہوئی کیونکہ بیچ میں گہرا نالہ ہے اور دونوں طرف اونچی چٹانیں۔ میر جاگر سب سے نکل کر جب میوند کی طرف گئے تو یہاں ترکوں نے انھیں گھیر لیا۔ ترکوں کے

ساتھ بڑی فوج تھی۔ ہاتھی، گھڑسوار اور پیدل فوج۔ مگر سب سے زیادہ ڈر ہاتھیوں سے تھا۔ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ بی بی ہانی سے صلاح و مشورہ کیا۔ انھوں نے جو مشورہ دیا وہ واقعی بہت مؤثر اور فوجی لحاظ سے بہت ہی کامیاب ثابت ہوا۔ کہنے لگیں کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ترکوں کا گھیرا قلعہ مندی سے تو راجا جاسکتا ہے۔ سارے اونٹوں کے بچوں کو اکٹھا کر وان کی دُموں میں مشعلیں باندھ کر کجاووں پر لکڑیاں لاد دو، جب شام پڑے تو مشعلوں کو آگ لگا کر چھوڑ دینا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ رات کو آگ کی اس طرح حرکت دیکھ کر ہاتھی گھبرا گئے۔ ہاتھیوں کے ساتھ ٹھوڑے اور اونٹ بھی اوہرا دھر بھاگے اور افراتفری کے عالم میں گھیرا ٹوٹ گیا۔

یہ قصے سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں لیکن میر جا پر کی بہادری اور ان کی قیادت میں کسی کو کوئی شک نہیں کچھ لوگ ابھی تک میر جا پر کو صاحب کرامت اور ولی سمجھتے ہیں۔ کہاوت مشہور ہے کہ ڈنگن کے پیاز پر بھی تک میر جا پر کی زرہ پڑی ہے اس پر جانے کا کوئی راستہ نہیں لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ وہ صاحب کرامت تھے اس وجہ سے آسمانی وہاں جا اور آسکتے تھے۔ ”ڈنگن“ پہاڑی چڑھائی واقعی بہت مشکل ہے۔ مگر یہ پانی باتیں ہونگی اب لوگ وہاں رہتے ہیں۔ جاتے اور آتے ہیں۔ ہم بھی وہاں گئے تھے مگر زرہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ جب میر جا پر کی زرہ کی بات ہوئی رہی ہے تو ایک روایت اس کے بارے میں اور سن لیجئے۔ جا کر تنگی پر جب میر جا پر نے ترکوں کا گھیرا توڑا اور ترک ”بچے“ بننے لگے تو تنگی کے اوپر سے میر جا پر نے اپنے علاقے پر نظر ڈالی اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی زرہ، تلوار اور ڈھال چھوڑی۔ ساتھ میں ایک لوڑی (میراثی) تھا۔ اسے وہیں موت کے گھاٹ اتار کر کہیں دوسروں سے آنسو بہانے کا ذکر نہ کر دے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میر جا پر اور ان کے ساتھیوں نے پنجاب کی رادل اور وہیں جا بسے۔ ان کے یہ ساتھی بجا خان بھی تھے جن کا ذکر آگے وضاحت سے ہو گا۔ وہ بھی گئے مگر واپس آ گئے اور میر جا پر سے اس بات پر مصر رہے کہ سب کا علاقہ پھر لڑ کر واپس لیں۔

دوسری روایت جو زیادہ مستند ہے کہ ہالیوں جب خراسان سے چلا تو ۱۵۶۷ء میں دہلی پر چڑھائی کی۔ وہ درہ بولان ہی سے گزرا تو میر جا پر کو مع ان کی بلوچی فوج کے ساتھ لے گیا۔ جب قتیاب بو اتو بلوچوں



کو ان کی بہادری اور خدمت کے صلے میں علاقہ سنگڑھ ضلع ساہیوال جسے انگریزوں نے منٹگمری کا نام دیا تھا۔ مگر اب پچیس سال ہو گیا ہے، کا علاقہ انعام میں دیا۔ بیچارہ منٹگمری اب بھی بیقرار ہو گا کہ پاکستان کو مجھ سے ہی بری تھا۔ کیمبل، جیکب، ایبٹ اور پتا نہیں کتنے اور ہوں گے جن کا نام پر ابھی تک پاکستان میں شہر آباد ہیں۔ ان کے ناموں میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بات میرا چاکر اور سنگڑھ کی تھی جو انہیں عطا کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سنگڑھ (ست گھر) بندی لفظ ہے جس کے معنی سات گھر (سات خانے) کے ہیں۔ میرا چاکر کے پانچ بھائی تھے یعنی میر شہزاد، میر اللہ داد، میر داد، میر باغیان، میر نوح۔ تو پانچ خانے تو ہو گئے لڑکوں کے۔ ایک خانہ اپنے لیے اور ایک خانہ اپنی بیگم بی بی بانی کے لیے۔ جو کہ خود بھی اس ہم پر نفس نفیس خاوند نہ تھیں۔ تیار کیے گئے۔ میرا چاکر اُدھر رہ گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ اگر بھی ساہیوال جانے کا اتفاق ہوا تو تاریخی نقطہ نظر سے ہم اس کے پتہ چلانے کی کوشش کریں گے۔

سیال کی تاریخ کا ان کی ذات سے براہ راست تعلق ہے۔ سنگڑھ میں کافی بلوچ آباد ہیں۔ اب تو شاید نام کے بلوچ رہ گئے ہوں۔ میرا مطلب زبان، لباس اور طور طریقے سے ہے۔ اتنا عرض کرنے کے بعد روایات کو قائم رکھنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

میرا چاکر کے اس طرح علاقہ چھوڑ دینے سے بلوچوں کی قیادت میں ایک وسیع ضلع پیدا ہو گیا۔ بلوچ کافی تعداد میں سندھ اور ڈیرہ جات کی طرف نکل گئے۔ بہاولپور، مظفر گڑھ اور شمالی پنجاب پہنچے۔ کچھ نے جنوبی ہندوستان کا رخ کیا۔ قلات کے علاقے کوئیہ مندو کے سپریم جو زیادہ دیر تک قبضے میں نہ رہ سکا۔ میرا چاکر کے جانے کے بعد رندوں یا یوں کہتے کہ بلوچوں کا زور ٹوٹ گیا۔ اب کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو انہیں مکی کر سکتی سب بکھر گئے۔ جہاں جس کو حملہ مل آباد ہو گئے، پھر کچھ نے خانہ بدوشی اختیار کر لی۔ جو پیچھے رہ گئے انہوں نے اپنی اپنی تہن داری سنبھالی۔

تھوڑے عرصے بعد جو بلوچوں کے فرقے بلوچستان میں رہ گئے تھے انہوں نے خان آف قلات کی تاج پوری قبول کر لی۔ لوگ تو پہلے ہی دیکھتے ہیں تو اکثر نے یہی کیا۔ بعض نے اپنا بلوچی نام چھوڑ کر براہویوں کے ساتھ ملائت انتہی کی۔ بالکل زنی جواب براہوی کہلاتے ہیں۔ دراصل بلوچ فرقے رند سے ہیں۔ کہنے کو تو براہوی



بھی ایک قسم کے بلوچ ہیں مگر براہوی اور بلوچ حالانکہ صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں مگر دونوں کے فلاح اور راہ و رسم میں بڑا فرق ہے۔ دونوں کی زبانیں ملیدہ ہیں یہاں سردار صاحبان کی بات نہیں ہو رہی بلکہ ایک عام آدمی کی۔ سرداروں کے خاندان تو بہت ایڈوانس ہیں۔ آپس میں رشتہ داریاں ہیں۔ رہن سہن بھی تقریباً فارن ہے۔ جہاں تک عام آدمی کا تعلق ہے۔ براہوی دوسرے قبیلوں میں رشتہ دینے میں کوئی عار نہیں کرتے حالانکہ اور بلوچ اس کو براہماتے ہیں۔ براہوی جن کے پاس جانوروں ان کا دودھ پیچنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ بلوچ اس کو میوہ سمجھتے ہیں۔ بلوچوں اور براہویوں کی پوشاک میں بھی فرق ہے۔ نامیٹ سے مری گئی مزارعی وغیرہ۔ یہ لوگ جلی جب نما کرتے پینتے ہیں۔ براہوی صرف ایک دراز چولہا پیرا بن زیب تن کرتے ہیں۔ کرتہ نہیں پہنتے۔ بلوچ پورٹس گنگر جو گاؤں کے نمونے کا فرک ہوتا ہے پہنتی ہیں۔ یہ رواج ملب سے چلا آ رہا ہے ظاہر ہے کہ بلوچ اور براہوی ہمیشہ سے جدا کرتے تھے۔

ہاں تو بناب بات کہجے قومیتوں کی۔ کہاں تک چلیے گا۔ آپ پاکستان کی سطح پر قومیت کی بات کرتے ہیں یہاں تو اس لحاظ سے اس لحاظ سے کتنی قومیتیں ہو گئیں۔ ابھی تو کھتران اور پٹانوں کا ذکر ہی نہیں آیا اس بحث کو جانے دیں تو بہتر ہے۔ دراصل ان نعروں کے درپردہ میں ہوتا ہے یعنی آپ نے سلسلہ شروع کیا پاکستان سے پھر آئے قومیت پھر آجائیں قبیلے پھر فرقے پڑ اور پھر آخر میں بات میں پہنچتی ہے دراصل آخر میں تو میں نہیں ہوتا۔ یہ تو ہوتا ہے شروع میں۔ یا یوں کہہ لیجئے اولین چیز میں ہوتا ہے۔ لوگوں کو کھانے کے لئے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا مگر بانٹنے والے جانتے ہیں کہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ ہم نے تازہ آپسے سامنے بیان کر دی۔ اب ذرا اس پر سوچیے کس کا نقصان ہوا اور ہورہا ہے۔ بڑے بڑے مفصلین نے تو یہاں تک کہ مذہب کی بنیاد بھی میں کو کم کرنے پر ہوتی ہے۔ مگر کیا یاد ہے حضرت انسان کی فطری عادتوں کا۔ بکھر تو قومیں یکجا ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ دیکھ لیجئے یورپ کو اور آپ قومیت کی بات کر رہے ہیں۔ کہاں تک نتائج کو پیچھے گھسیٹے گا۔ اسلام کی اگر بات کرتے ہیں تو۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

جذب باہم جو نہیں مفصل انجم بھی نہیں

بھائی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بات تو صرف حالات کی ہے کسی نے نعرہ لگایا قومیت کا تو دنیا لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی اس میں تو کسی کو مار نہیں ہو سکتا کہ جناب کافی لوگ اس نعرے کے پیچھے ہیں۔ اب زبانی جمع شروع ہے ایک دوسرے پر لعن ملن۔ یہ باتیں بحث سے تو دور نہیں کی جاسکتیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچئے اس کا تدارک کیجئے۔ بات "مافی" اور حال "ہر" کر رک جاتی ہے۔ ابھی تک یہاں زرعی ترقی، صنعتی کارخانے، معاشی انصاف کا لوگوں نے نام بھی نہ سنا تھا۔ اب سن رہے ہیں۔ اب تک سنتے ہی کیسے تعلیم نڈارد قبولوں کی ایک الگ دنیا بس ہے۔ دوسروں سے سروکار نہیں پھر کہاں سے قومی سطح پر ہم آہنگی ہوتی۔ انگریز ایسے علاقوں کے لئے ایک نقطہ چھوڑ گیا تھا یعنی پیسی فیکیشن (PACIFICATION)۔ جس کا سلیبس اردو میں ترجمہ کیا جائے تو مزہ نہیں آسکا۔ عام اردو میں ٹھنڈا کرنا کافی مؤثر ہوگا۔ مطلب یہ کہ جب گرمی پیدا ہو تو پانی ڈال دینے سے آہٹ ہو جائے گی۔ اسی لئے ایسے علاقوں میں اس نے ایسی ہی انتظامیہ قائم کی تھی یعنی جب بھی گرد بڑ شروع ہوئی جو توڑ شروع ہو گیا۔ سردار صاحبان میں پیسہ بانٹا اور آپس میں لڑوا دیا اور معاملہ کچھ عرصے کے لئے ٹھنڈا۔ اب جب آزاد ملک بن گئی تو "ٹھنڈا" کرنے سے کام نہیں بنتا۔ اب ضرورت ہے ترقی یا ڈویلپمنٹ (DEVELOPMENT) کی۔ مافی کو حال میں لانا۔ آزاد ملک میں جہاں قوم کی بات کی جاتی ہے تو قوم کی فلاح کی بھی بات کیجئے۔ ٹھنڈا کرنے کی بات نہ کریں۔ ٹھنڈا کرنے کرتے آگ بھڑک اٹھتی ہے جو بھجائے نہیں بھتی۔ بہر حال کام کچھ تو شروع ہو چکا ہے۔ اس میں جا بجا رکاوٹیں بھی پیش آ رہی ہیں۔ آخر نظام تبدیل کرتے ہوئے دیر تو لگے گی۔





موزیوں اور بیچے ڈاکٹر سے ملنے کا رستہ ہے

پوچھتہ۔ ماضی۔ حال۔ مستقبل







## مری۔ انگریز کے دور میں

### مری کی وجہ تسمیہ :

بلوچیوں کے بارے میں عام بحث کافی ہو گئی۔ اب ہم مری قبیلہ کے بارے میں وضاحت کرنا چاہتے ہیں جس کا اس کتب سے براہ راست تعلق ہے۔ میر جاگیر تو سارے بلوچیوں کے ہیرو ہیں۔ جب وہ ہمایوں کے ساتھ جانے لگے تو انہوں نے اپنے قبیلے کو ایک فرقے کے تمندار جن کا نام بجار خان تھا، ساتھ جانے کو کہا۔ یہ فرقہ اس وقت تمندار کے نام پر ”بجارتی“ کہلاتا تھا۔ میر جاگیر کے بے صدا مراد پر بھی وہ ساتھ چلنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ غصے میں انہوں نے کہا: ”بجار خان مری ہے“ مری کے معنی ”ضدی یا جن“ کے ہیں۔ اسی دن سے قبیلے کا نام ”مری“ پڑ گیا۔ ایک روایت اور بھی ہے۔ پہلے یہ لوگ ”کچھ مورائی“ میں آباد تھے۔ اس لئے پہلے انہیں ”مورائی“ کہا جاتا تھا۔ پھر کثرت استعمال سے ”مری“ ہو گیا۔

میر جاگیر کے جانے کے بعد بجار خان کے ساتھ معتبرین میں سے ”مندو خان“ علی خان، رند اور ان کے علاوہ ایک ”لوباز“ ایک ”باغبان“ جن کو کانگرا کہا جاتا تھا اور ایک حبشی جنہیں شاہجہ کہتے تھے، موجود تھے۔ ان سب کی اولاد اور ساتھیوں کو ملا کر مری قبیلے کی داغ بیل پڑی۔

یہ لوگ اس وقت مہونہ اور تدریجاً رور، مندو تحصیل اور کچھ مورائی کے علاقے میں آباد تھے۔ ان کے قریب کھمٹی اور کچائی قبیلے بھی آباد تھے۔ لیکن اب ان کا نام و نشان بھی مشکل سے ہی ملتا ہے البتہ کہیں کہیں پر ان کی یادگاریں باقی ہیں مگر اب وہ بھی معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔

بلوچستان میں قبیلوں کی آبادی کے لحاظ سے مری قبیلے کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ لڑائی اور بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور ہو بھی کیوں نہ۔ جس کسی کی اپنوں میں نہ بٹی یا لڑائی ہو گئی ہو گی ان کے پاس امان لینے کی دفعہ امان لینے والے ایک دو نہیں بلکہ سو دو سو سے بھی زیادہ اور پھر ان کے ساتھ ایسے مدغم ہوتے کہ "مری" بن جاتے۔

مری قبیلے کے تین بڑے جزوی قبیلے ہیں جنہیں ان کی اصلاح میں مکر کہا جاتا ہے۔ یعنی "بجرائی" جو کہ بخارخان کی اولاد یا ان کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ "لوہارائی" جن کا سلسلہ نوہار سے چلا اور گزنی "جو کہ" غازو یا غزن کی اولاد سے ہیں "غازو" یا "غزن" ایک بلیدی لڑکا تھا جسے علی خان نے پالا تھا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ہر ایک "مکر" پھر "فرقہ" میں منقسم ہے پھر ان کے جزوی فرقے ہوتے جاتے ہیں۔ وضاحت کے لئے دیئے گئے نقشے کو ملاحظہ کیجئے۔ یہ نقشہ گزنی سے لیا گیا ہے۔

جیسے جیسے مریوں کا زور بڑھتا گیا اور قبائل بھی ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ جب بھی کوئی نووار قبیلے میں داخل ہوتا تو وہ نیکی بدی میں ساتھ رہنے کی قسم کھاتا۔ وفاداری تو اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی خاص طور سے قبائلی رسم و رواج کے تحت جب تک کہ خون کا رشتہ قائم نہ ہو۔ نووار دوں کو اپنی لڑکی یا لڑکا رشتہ میں دینا ہوتا اور اس طرح پکار رشتہ قبیلے کے ساتھ قائم ہو جاتا۔ جب آبادی بڑھتی ہے تو پھیلنے کے لئے زمین بھی ضروری ہے۔ لہذا انہوں نے پردیسوں کو مجبور کیا کہ اپنی زمین دو۔ اگر نہیں دیتے تو پھر فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا۔ کچھ تو ڈر گئے اور کچھ کو زور سے پیچھے ہٹا دیا۔ حسنی، بروزی اور دیگر قبائل اپنی زمینوں سے دستبردار ہو گئے۔ اب علاقہ تو مل گیا مگر ڈر یہ تھا کہ کہیں آپس میں لڑائیاں شروع نہ ہو جائیں۔ اس لئے آپس میں مل بیٹھ کر زمینوں کو بانٹا گیا۔ یہ بانٹ اس طرح ہوئی کہ پہلے مکر وں اور پھر فرقوں کی حد بندی ہوئی۔ یہی سلسلہ ابھی تک چلا آتا ہے۔ دس پندرہ سال گزرنے کے بعد ازبکوں

حدود متعین کی جاتی ہیں۔ پہلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ جنگ ہوئی، نیا علاقہ فتح کیا تو جناب اس میں سے پانچواں حصہ تو سردار کا باقی حصوں کو ٹکروں میں تقسیم کر دیا۔ ٹکروں کے تمنداروں نے اسی حصہ سے اپنا حصہ رکھا اور باقی مسرقوں کے سپرد۔ اب آئی باری فرقوں کی تو وڈیرے نے اپنا حصہ رکھا اور باقی قومی ملکیت۔ چونکہ تمنداری اور باقی عہدے وڈیروں کے اس لئے ان لوگوں کی اپنی ملکیت ہوئی۔ عام آدمی بچاؤ قومی ملکیت میں پھنسا۔ قومی ملکیت کا تو حال آپ کو معلوم ہی ہے، مال چرائی کروا کر کسی کو کاشت کاری کے لئے دیا بھی تو حصہ کیا آئے گا۔ جسے کی سب عجیب حالت ہے۔ جنا۔ جسے کے وقت بھی حسب و نسب کا خیال رکھا جاتا ہے۔

شروع شروع میں حد بندی سے بہت فائدہ ہوا اور یہی سلسلہ ابھی تک چلا آ رہا ہے۔ لوگ اپنی اپنی حدود میں اپنے علاقے کے ذمہ دار ہو گئے اور پھر جب کبھی جنگ کرنی ہوئی یا علاقے کا دفاع کرنا ہوا، منفرد علاقے کے لوگ اپنا اپنا لشکر لے کر اکٹھے ہو گئے۔ ہر ایک قبیلے کا اپنا کمانڈر بھی ہوتا اور اعلیٰ کمان سردار سنبھالتا اور پھر جنگی کونسل تشکیل میں آتی لڑائی کی چالوں پر غور ہوتا۔ اب آئے جسے میدان میں سنبھے یہ بھی ہر دفعہ ہوتا آیا ہے۔ اس دفعہ بھی تقریباً یہی ہوا۔ حال کو اب جانے دیں۔ ماضی کی تھوڑی بات اور جو جائے "زن" "زر" زمین ہمیشہ لڑائی کی جڑ ہے۔ زمین آئی۔ زن تو پہلے ہی موجود تھی۔ زر بھی تھوڑا بہت اکٹھا ہوا۔ آپس میں لڑائیاں ہو گئیں۔ بجا رخاں جنہوں نے بجا رانی قبیلے کی داغ بیل ڈالتی تھی انہوں نے سارے مرلوں کو اکٹھا کیا اور سردار بن گئے یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ رہا۔ پھر سرداری گزینیوں کے پاس آئی جو ابھی تک ہے ویسے بچ ہیں ایک دفعہ سرداری کسی اور کے پاس بھی رہی۔

جب کبھی بھی باہر سے لڑنے والا نہ ملا تو آپس کے جھگڑے شروع ہو جاتے۔ لیکن جب بھی سردار ٹکڑا ہوا تو امن وامان قائم رہتا۔ سرداری گزینیوں کے ہاتھ آتی تو پچاس سو در سادھک تھا۔ سرداری کو مستحکم کرنے اور امن وامان برقرار رکھنے کے لئے نئے رواج اور قانون بنائے گئے۔ اگر کوئی بھی ان کی خلاف ورزی کرتا تو لوگوں کو ماری جاتی۔ کیا بات ہے گردن مارنے کی۔ اس طرح تو شکل جلدی آسان ہو جاتی ہے مزار تو تیسہ کچھ گھٹ گھٹ کر جان نکلے مالکوں کو نصیحت ہو۔



ہاں تو نئے رواج بنے۔ گھال کو رائج کیا گیا۔ یعنی ہر بیس بھڑوں پر سال میں ایک بھڑ سرداری۔ یہ رواج حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ جب کبھی بھی سردار کے کارندے یا ہرکارے کسی علاقے میں جاتے تو انہیں بھی مڈرا دینا منوری قرار پایا۔ اس کے علاوہ سرداری خاندان میں اگر کوئی تقریب ہو جیسے کہ لڑکے کی شادی یا سنتہ تو بھی ہر ایک وڈیرے کو حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کرنا واجب تھا۔ وڈیرہ کب اپنے پاس سے دیتا ہے۔ بارہنچے والوں پر۔ مقدمات کے فیصلے ہوتے جرمانہ بھرا جاتا۔ اس کا آدھا حصہ سردار کا۔ سردار کو شادی کرنی ہوتی تب بھی خاص قسم کا ٹیکس رعایا پر لگتا۔ اس کے علاوہ کچھ پیسہ سردار کو سرکار برطانیہ دینی تھی۔ وہ اب تک حکومت پاکستان کے ذمے تھا۔ امن وامان قائم رکھنے کے لئے ایوی یعنی ایک قسم کی سردار کی اپنی فوج ہوتی تھی۔ پہلے اس کا خرچہ سرکار برطانیہ دیتی تھی۔ اس کے بعد حکومت پاکستان ابھی تک مگر بڑے پیسے برداشت کرتی تھی۔ اس کا ذکر وضاحت سے کہیں اور کیا جائے گا۔ کچھ اچھے رواج بھی تھے۔ رواج کی پابندی ہر ایک شخص کرتا اگر کسی نے ان کو پامال کرنے کی کوشش کی تو فہر سردار نازل ہوتا کہ الامان الخفیظہ۔ اگر کوئی مسافر یا جوہاری علاقے میں آتا تو وڈیرہ یا سردار اسے ایک انگوٹھی دیتا جو پاپیورٹ کا کام کرتی اور محفوظ و مامون سفر کرتا تھا۔ اس کام کے لئے سردار اپنی فیس بھی لیتا۔ یہ رواج ذرا سی ترمیم کے ساتھ اب تک چلا آ رہا ہے۔ وہ یہ کہ جیسے سردار کی بجائے وڈیرے لیتے ہیں۔ سارے ہندو جوہاری ٹیکس دیتے رہے ہیں۔ اگر کسی باہر والے سے لڑائی ہوتی یا کوئی آپس کا معاملہ ہوتا تو جرگہ اکٹھا ہوتا۔ سردار جو فیصلہ دیتا تو یہ حکم پورا قبیلہ ایک ہو کر مانتا۔ کسی کی کیا مجال ٹیچے بٹے۔ یہ رواج صدیوں پہلا تو مری سردار کی حیثیت اور قبائلی سرداروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہی۔ سردار کو عام آدمی نہیں گنا جاتا۔ مطلب یہ کہ اس کی حیثیت انسان سے بڑھ کر تھی جس میں بزرگی سے بھی بڑھ کر کوئی وجہ ہے تو وہ دیا گیا ہے۔

۱۷۵۰ء سے ۱۷۹۴ء تک جب نصیر خان قلات کے خان تھے مری گئی علاقہ قلات کی مملداری میں

رہا۔ ان کے رویہ سے لوگ کافی متاثر تھے کیونکہ یہ ان لوگوں کی جائز مدد بھی کرتے تھے۔ ویسے مملداری نام کو ہی تھی کیونکہ جزیہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سال میں ایک دفعہ مری گئی کے سردار یا ان کے نمائندے ان کے دربار میں حاضر ہوتے۔ نصیر خان کے انتقال کے بعد یہ گرفت بھی ڈھیل ہو گئی بس پھر کیا تھا۔ پڑوسیوں کی

مصیبت - مجال ہے کہ کوئی ان کے راستے سے گزر جائے۔

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ انگریزوں نے ۱۸۳۹ء میں افغانستان پر چڑھائی کی۔ سب کے پاس سے جب انگریز فوج گزری تو اسے تنگ کیا گیا۔ لہذا انگریزوں نے تہی پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کے بعد اس نے مری گئی علاقے کی طرف بھی رخ کیا۔ میجر بیور کو حکم ملا کہ ان لوگوں کی خبر لی جائے اور احکامات کے مطابق یعنی "سب سے سکیا جائے۔" انگریزوں کو کیا ہمدردی۔ زبان بھی "امپریلسٹ" (IMPERIALIST) بولتا تھا۔ عورتوں بچوں سمیت گھر جلائے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ توپ کے سامنے باندھا اور آڑا دیا۔ آگ اور خون کا کھیل کھیلے ہوئے۔ کہاں پہنچے جو مریوں کا صدر مقام تھا۔ "کہاں" کا قلعہ فتح کیا اور کپٹن لوئس براؤن کو حکم دیا کہ کہاں میں رہے تاکہ سرکار برطانیہ کا قبضہ بچتے ہو جائے۔ کپتان صاحب کے ہمراہ تین سو جوان بمبئی انفنٹری کے، پیاس گھڑ سوار ہندو ہارس (SCINDE HORSE) کے اور پیاس چٹان گھڑ سوار تھے۔ ٹھوڑے دنوں کے بعد اپنے ایجنٹ کو تین سو سیل فوج و پیاس گھڑ سواروں کے واپس پھیلنے کی رسم کے لئے بھیجا۔ جب یہ دستہ "مرتاغ سنگی" کے پاس پہنچا تو مری گھات لگائے۔ میٹھے تھے گھات اتنی عمدہ تھی کہ انٹینٹ مع اپنے آدمیوں کے مارے گئے۔ صرف ہارہ آدمی زندہ بچ سکے۔ اس بعد کو ہم نے خود بھی دیکھا ہے۔ مری قبائل کی فوجی صلاحیت کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اب کپٹن براؤن صاحب مع ایک سو پالیس آدمیوں کے کہاں میں پھنس گئے۔ انگریزوں نے اپنے آدمیوں کو توڑ کہاں سے نکالنا تھا۔ فوراً ایک دستہ میجر کلیبورن کی قیادت میں مع بمبئی گرنیڈیرز کے ۲۶۳ سپاہی اور ۶۶ گھڑ سواروں کے جوڑا ہارس اور ہندو ہارس پر مشتمل تھے روانہ کیا۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ چار توپیں بھی تھیں۔ یہ ہینڈ آرگن کا تھا۔ گرمی ماہ اگست میں اپنے وطن پر ہوتی ہے۔ مری قبائل کی فوجی ہرمنندی اور عقلمندی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انھیں پتہ تھا کہ انگریز اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لئے ضرور آئے گا۔ اس مرتبہ انہوں نے نفوسک پاس پر گھات لگائی۔ جب فرنگی فوج ادھر سے گزری تو اس پر دھاوا بول لیا۔ یہاں پر پانی کی کمی اور علاقہ پہاڑی کھل کر لڑائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سارا دن لڑائی جاری رہی۔ پیاسی فوج کہاں تک لڑتی۔ پہاڑوں کی وجہ سے نہ تو توپ خانہ ٹھیک طریقے سے استعمال ہو سکتا تھا۔ نہ ہی گھوڑے۔ لہذا انگریزوں نے واپسی کی ٹھانی۔ اس لڑائی میں چار انگریز اسفردو کالے اور ۸، اسپاہی کام آئے اور ۹۲ زخمی ہوئے۔ توپیں اور باقی ساز و سامان میدان جنگ

کی نذر کیا اور جانیں بچائیں۔ یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ مری کبھی علاقے میں دو بدولت آتی ہنگی پڑے گی۔ فرنگی نے پینز آباد لا اور روپیہ پیسہ دے کر جان چھڑائی۔ اس وقت مریوں کا سردار دودا خان تھا اس نے کیپٹن براؤن اور ان کی فوج کو واپس جانے کی اجازت دی اور وعدہ خوب نبھایا۔ اب جناب دیکھیے انگریز کی دور اندیشی اس کی سیاست اور چال بازی جس کی وجہ سے اس نے صدیوں ہم پر حکومت کی۔ پھر اپنی بے وقوفی یہ کہ ہم آپس کے قومیتوں اور قوموں کے جھگڑے، نا اتفاقی بھالت اور زبان اور لباس کے چکر میں پڑے۔

”مذکورہ انگریز کی چال بازیوں کا پورا تھا“ انگریز نے سب پہلے سی کے آس پاس کے قبائل کو ملایا، کچھ ڈرا کر کچھ دھمکا کر۔ پہلایا بھی اور پھسلایا بھی لاپنج بھی دیا۔ ان پر زور ڈالنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میدانِ علاقے میں لوگ اکٹھے ہو کر رہتے تھے۔ زمینیں تھیں۔ مری علاقے کی طرح تو نہ تھا کہ نہ گھر نہ بار۔ حملہ کیا اور غائب۔ پہاڑی علاقے میں پچھا کرنا مشکل۔ مری قبائل میں بھی پیسے بانٹے کہ ہیں دم لینے دو۔ پھر جناب ۱۸۴۹ء میں مری اور براہویوں کو لڑا دیا۔ براہویوں کو کہا کہ یہ تمہاری رعایا رہے ہیں اور تم اپنے علاقے میں امن قائم نہیں رکھ سکتے۔ انھیں سیدھا کروہم مدد کے لئے حاضر ہیں۔ انھیں تیار۔ روپے پیسے دیئے اور قبائلیوں کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔ مریوں کو پیغام بھیجا کہ خبردار جو درہ بولان کے قریب پھٹکے، ہم آئیں گے جس میں ہمت ہو ہیں روکے۔ ”مذکورہ قبیلہ آؤ دیکھا نہ تاؤ“ بلبلانی ”جو کہ درہ بولان کے سرے پر ہے“ مری حملہ کر بیٹھے۔ حملہ آور ۱۳۰۰ تھے جن میں میں سے ۵۰ کام آئے۔ یہی غلطی تھوڑے دنوں بعد پھر مریوں نے بڑی پر حملہ کر کے کی۔ مری قبائل کا زور کچھ کم ہوا اب یہاں کے قبائل انگریز کو تو بھول ہی گئے انھیں نے آپس کے جھگڑے شروع کر دیئے علاقہ بھی ٹھنڈا یعنی سی سیفائی (PACIFY) ہوتا رہا۔ رسل و رسائل کے راستے کھلیں، آپس میں خونریزی جاری ہے۔ انگریز تو ہر ایک قبیلے کا دوست تھا۔ پیسہ تو ہر ایک کو مل ہی رہا تھا۔ مری علاقے کی موجودہ بولان کے نزدیک تھی اس کا تو علاج ہو گیا۔ اب رہ گیا وہ علاقہ جو پنجاب سے ملتا تھا تو کبھی قبیلے کو اکسایا گیا۔ گیسٹوں نے موقعِ قیمت بنانا اور ابھی خامی ٹوٹا کر کے اپنے علاقے میں واپس ہو گئے۔ اس طرح مری قبائل کا زور کافی حد تک کم ہو گیا۔

سرکارِ برطانیہ کو جب یہ یقین ہو گیا کہ قبائل آپس میں بٹ چکے ہیں اور ان میں پھوٹ پڑ چکی ہے، نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اس دشمنی کا جب یقین اور پورا ایشع تیار ہو گیا تو انگریز امن کے



دیوتا کا کردار ادا کرنے نکلا۔ وہی نواب ابدیاتی پالیسی یعنی آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو (DIVIDE & RULE) نتیجاً کی۔ ۱۸۵۹ء میں خان آف قلات کو احکام پہنچے کہ چونکہ یہ آپکا علاقہ ہے ہر قیمت پر یہاں امن وامان قائم ہونا ضروری ہے اس لیے آپ کی اس کارروائی میں ہر قسم کی مدد کی جائے گی۔

خان صاحب نے اپنا شکریا کیا۔ اور سرے انگریز نے اپنی فوج بھی شامل کی۔ سرسبز گرن اور جنرل جیکب جن کے نام پر آج تک جیکب آباد بسا ہوا ہے اور بارہ گاہ اور جنرل ممدوح لشکر کے ساتھ بابر رکاب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس لشکر میں چار ہزار پیدل فوج اور چار ہزار گھڑ سوار موجود تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت بڑی فوج تھی کیونکہ یہاں کی آبادی بھی تقریباً اتنی ہی ہوگی۔ حملے کا ارادہ کہان اور ڈیرہ گمٹی پر تھا یہ مری اور گمٹی قبائل کے صدر مقام تھے۔ اگر دارقابو میں آجائیں تو آدھا کام ویسے ہی ختم ہو جائے گا۔ انگریز نے خود تو حمزے کی نہیں ٹھانی۔ تو بہ تو بہ یہ بات تو خود وہاں کے لوگوں نے انگریز سے کہی تھی کہ خدائے واسطے امن وامان قائم کرو۔ حملہ آور کامیاب ہوا۔ شہر پسندوں کو غیر تنگ سزائیں دی گئیں اور صاف صاف بتا دیا کہ اگر پھر کسی نے شہر پسندی کی تو غیر تنگ سزا دی جائے گی۔

جب حالات ٹھیک ہوئے تو انگریز نے سوچا کہ اس غیر نفع بخش علاقے پر خرچہ بیکار ہے مگر علاقے کو بھی قابو میں رکھنا ہے۔ سرداروں کو جاگیروں سے نوازا پیسہ دیئے اور کہا کہ تم لوگ اپنی فوج رکھو اور اپنی روایات کے طور پر حکمرانی کرو مگر امن رہنا چاہیے۔ سرکار برطانیہ کو کوئی تکلیف نہ ہو ورنہ پھر وہی حشر ہوگا۔ اگر یہ شرائط منظور ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کوئی اور سردار مقرر کر دیں گے اور بعض اوقات کر کے بھی دکھایا۔ اب یہ علاقہ تو قابو میں لایا قلات تو ویسے ہی ان میں چمکتا تھا مگر اثر کافی نہ تھا۔ اب تو طاقت کے کس بلق اس اثر کو مستحکم کیا گیا۔

۱۸۷۵ء میں میجر سنڈے مان صاحب نے مری گمٹی سرداروں کو طلب کیا اور ان سے کہا اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ ہیں تو پھر قلات جانے کے لئے تیاری کریں۔ کون منع کر سکتا تھا۔ ایسا ہی ہوا اور قلات پر انگریز کی کئی حکومت قائم ہوئی۔ مری اور گمٹی علاقے کی طرز پر۔ ۱۸۷۶ء میں جب پورا علاقہ قبضے میں آگیا تو بندوبست مکمل کرنے کے لیے کوئٹہ میں بلوچستان ایجنسی قائم کی گئی۔

انگریز جب تک یہاں رہا چھوٹے موٹے قلعے ہوتے رہے مگر جب بھی گزربڑھوئی تو سزا کی اپریلیسٹ کے



طور پر آپ کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ انگریز تمہاری امپریسٹ بغیر ایسے کام کیسے چلتا مگر وقت دقت کی بات ہوتی ہے۔ آپ اپنوں کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔ کیجئے وہی حشر ہو گا جو کہ تاریخ بار بار دہراتی رہی ہے۔ بہر حال جب تک انگریز رہا یہ چوٹے موٹے قسے چلتے رہے مگر ان کا تدارک زور سے کیا۔ انگریز چلا گیا مگر کالے انگریز چھوڑ گیا کہ اس پر عمل جو ہم نے تم کو سکھایا ہے مت بات کرو نیشنلزم یا اسلام کی تم لوگ حکمران ہو حکمران حکمران ہونے کے سیاہ و سفید کا مالک۔ ڈنڈا چلاؤ اس ٹھیک رہے گا کہیں ڈیفنڈ ایریا میں بھی ترقی ہوئی ہے: ٹھنڈا کرو اور روپیہ بانٹو اور آپس میں لڑاؤ۔ یاد رکھو ایسے حالات میں صرف ایک پالیسی ہوتی ہے آپس میں لڑاؤ اور حکومت کو فائدہ اٹھانے کے لیے ہمارا سارا نظام قائم رکھنا تو بہتر ہے اگر اس پر عمل نہ کیا تو زیادہ دیر نہ چلے جائے گا: ٹھنڈے دل سے اس کا جائزہ لیجئے کہ کہاں تک ہم نے انگریز کی اس پالیسی پر عمل کیا۔ کیا کھوایا کیا پایا۔



## مرکے قبائل

لوارانی	گزی	بجاری
شیرانی	بہاولان زئی	کلندرائی
بلہمانی	نوزبندگانی	راحمکائی
غازانی	مرغیائی	پیردادائی
گوسرائی	عایائی	سومرائی
سومرائی	اصفائی	سالارانی
محمدانی	بروار	سنگرائی
	لوہری کش	پواہی
	چوری	شاہجہ
	بڈیائی	کھلوانی
	لاکھپانی	قیصرانی
	مہکانی	
	چیلگری	
	ٹینگانی	
	مہندانی	
	ژنگ	
	مزارانی	









سیرت کی تصویر سیم پانی ہے

## قمری۔ آزادی کے بعد

پاکستان بننے کے بعد یہاں انتظاریہ میں یا فرق آیا وہ اگلے ابواب سے واضح ہو جائے گا۔ آج سے دو سال پہلے تک تو کوئی نمایاں فرق نہ نما نہیں ہوا تھا۔ وہی سرداری نظام اور تقریباً وہی حالات بلکہ یوں کہیے کہ انتظام کی گرفت بھی دھیلی ہی ہوتی گئی آگے چلیے عام آدمی کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا جب حالات میں ہی کوئی رد و بدل نہ ہو تو پھر آدمی کو اس سے کیا سروکار کہ انگریزی حکومت تھی یا پاکستان بن چکا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ پاکستان کے بننے کے بعد کی تاریخ کو چھوڑیے اور یہاں کے ہی مختلف لوگوں سے باتیں کر لیتے ہیں کہ ان کا کیا خیال ہے اور آج کل کے حالات اس نہ تک کیوں اور کیسے پہنچے، اس طرح تھوڑا بہت اندازہ تاریخ کا بھی ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات ان لوگوں کا حالات کے بارے میں اپنا کیا تجزیہ ہے۔ اس کا بھی پتہ چل جائے گا اور ہم اور آپ کون رٹے دینے والے۔ بیشک رائے دیں مگر ان لوگوں کی باتیں سن کر۔

ایک ہمارے دوست ہیں۔ رہنے والے کو حلو کے ہی ہیں مگر مری نہیں ہیں۔ وہ زر قونوں کے سردار ہیں۔ زر قون وادی کو حلو میں کافی آباد ہیں۔ یہ لوگ شپتو بولتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کے آباء و اجداد ایران سے آئے تھے اور یہاں بس گئے۔ ان کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے سردار صاحب کافی پڑھے لکھے ہیں کتب بینی

کا بھی بڑا شوق ہے۔ کافی نادر کتابیں ان کے پاس موجود ہیں۔ ایک دن ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم نے ان سے یہی سوال کیا کہ جو حالات آپ دیکھ رہے ہیں آخر یہ اس حد کو کیوں پہنچے۔ سردار صاحب کچھ سوچ کر بولے ”ان حالات کی وجہ رشوت ستانی اور علاقے کا غیر موثر کنٹرول ہے“

یہ بات سننے ہی ہم اچھل پڑے۔ جناب رشوت ستانی کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آج سے دو سال پہلے تو یہاں صرف ایک تحصیلدار صاحب ہی ہوتے تھے اور ان کے ذمے یہ سارا علاقہ۔ پولیٹیکل اینڈ منسٹر صاحب سبکی میں اور ان کے تحت اور بھی بڑا وسیع علاقہ تھا۔ سردار صاحب بات کاٹتے ہوئے رشوت ستانی سے مطلب آپس کی رشوت ستانی ہے

یہ بات ہو رہی تھی کہ ہمارے ایک مری دوست تشریف لے آئے۔ ان کی زمین میں دکان ہے۔ برکین کوٹھوسے کہاں کی جانب تقریباً چالیس میل پر واقع ہے۔ یہ بھی کچھ پڑے لکھے ہیں دکان ابی تھوڑے دن ہی ہوئے شروع کی ہے۔ اس سے پہلے تو ہندو ہی اس کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کا تبدیلہ کنگرانی ہے۔ آئے تھے۔ انھیں ایک ٹرک کی ضرورت تھی تاکہ اپنا سامان لے جائیں مگر ہم نے انھیں اپنے پاس بٹھالیا۔ انہوں نے بھی سردار صاحب کی بات سے اتفاق کیا۔

در اصل یہاں پرتین درجے کے لوگ شامل ہیں ایک تو بڑے لوگ جنہیں انگریزی میں PRIVILEGED class کہا جاتا ہے۔ ان میں اوپر درجے کے لوگ شامل ہیں جیسے تمندار اور ڈیرے۔ ان لوگوں کی اپنے علاقوں میں حکومت ہوتی ہے۔ اپنی زمینیں بھی ہیں باقی اوروں کی قومی ملکیت۔ آج سے پہلے ہی لوگ اپنے علاقے کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان کی ہوابداری صرف سرداری کو تھی۔ ان سب کی حکومت موروثی کسی علاقے میں جھگڑا ہو گیا۔ بلایا لوگوں کو۔ جرگہ اکٹھا کیا۔ جرگہ خود ہی بٹھاتے تھے۔ اب دونوں طرف سے پیسے لیے۔ پیسے لوگوں کے پاس کہاں ہوتے ہیں پیسے دے بیٹے ہی لیے اور فیصلہ اپنی مرضی سے کر لیا۔ جرمہ ادا کیا۔ آدمی قہر لگا۔ کے خزانے میں اور باقی اپنی زیادہ تر فیصلے خود ہی دیتے تھے۔ اب غریب آدمی اتنا تنگ آ گیا کہ وہ مقدمہ ہی لے جانے سے ڈرنے لگا۔ چھوٹے عقدے ڈیرے ہی طے کرتے تھے مگر یہاں جیل میں سزا کا سوال ہوتا تو اس کی وثیق کا حق صرف حکومت کے نمائندے ہی کو تھا۔ لوگ ان رواجوں میں اتنے جکڑے ہوئے تھے کہ ملزم کو ایک پروانہ دیا

جاتا تھا کہ تیس تین سال کی سزا ہوگئی وہ یہ پروانہ لے کر خود سٹی جیل میں حاضر ہو جاتا۔ نہ کوئی سپاہی ساتھ اور نہ کوئی گارڈیم چڑھ کر آگئے وضاحت سے کریں گے۔

اب جب سزا کی توثیق کا سوال آیا تو حکومت کے نمائندے کے پاس وڈیروں نے چکر لگھنے شروع کر دیے حکومت کے نمائندوں تک رسائی انہی لوگوں کی ہوتی تھی۔ کیونکہ نظم و نسق ہی یہ لوگ چلاتے تھے۔ جب رسائی انہی لوگوں کی تھی تو یہ لوگ اپنی فیس بھی لیتے تھے زر قون سردار صاحب زور دیتے ہوئے بولے اور ہمارے کنگرانی دوست نے بھی سر مل دیا۔ اس وقت جانے دیں۔ اب بھی آپ دیکھ لیں کہ جب آپ آئے تو وڈیرے آپ کے رورڈ گھومتے تھے کسی ک بھڑپ گم ہیں۔ راشن کا معاملہ ہے۔ ان کی سفارش آپ تک یہی لوگ لاتے تھے جب کام ہو گیا وڈیرے نے اپنی فیس فوراً سلا کی۔ بھائی بات تو ٹھیک ہے کئی دفعہ ہمیں بھی یہ شکایتیں ملیں جب تفتیش کی تو بات سچ نکلی۔

ہیں یہاں کہ ایک دفعہ ایک وڈیرے صاحب تشریف لائے کہ صاحب ہماری قوم کا آدمی گرفتار ہوا ہے یہ واردات کے علاقے میں رہتا ضرور ہے مگر اس کا ادارات میں کوئی بات نہیں وراس کی بوڑھی ماں یہاں ہے اسے چھوڑ دیں جب ضرورت ہوگی میں اسے حاضر کروں گا۔ ہمارے اوپر وڈیرے کی خدا ترسی کا بڑا اثر ہوا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ہم ویسے بھی ما آدمیوں سے ملنے جلنے کے قائل ہیں۔ ایک ہمارے دوست ہیں جو بھڑپ چراتے ہیں۔ اکثر شام کو ٹہلتے وقت ان سے ملاقات ہو جاتی ہے کچھ دن بعد جیلے تو شکوہ کرنے گئے۔ پھر آپ لوگ وڈیروں کے چکر میں گئے ہیں ہم ہاکن نہیں سمجھ۔ وضاحت چاہی تو پتہ چلا کہ وڈیرے صاحب نے آدمی کو چھڑانے کے لیے چار دسبے لیے ہیں۔ جب پوچھ چچہ کی تو بات درست نکلی۔ جب لوگ براہ راست آنے گئے تو وڈیروں کو تکلیف ضرور ہوئی۔

سہر کیف ہمارے کنگرانی دوست اور زر قون سردار صاحب اس کی وضاحت کرتے رہے کہ عام آدمی کو اتنا دبا کر رکھا گیا کہ وہ وڈیروں اور سرداری نظام کے خلاف کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ مگر عام آدمی پریشان ضرور رہا۔

اب دوسرا مقدمہ سبیل کے عام آدمی ہیں۔ عام آدمی تو جنب وڈیرے کی طرف دیکھتا ہے جتنا اگڑا وڈیرہ اتنا ہی زیادہ علاقے میں اس کا اثر۔ جتنا ظالم اتنے ہی لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ آپ ہماری بت کا پتہ نہیں نہیں کریں



یاد کریں۔ ہم این فرسن صاحب کی کتاب جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اس کے حوالے سے ایک قدر سناٹے پڑے ہیں آپ بھی سن لیجیے۔

یہ واقعہ ۱۹۵۵ء کا ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے این فرسن صاحب یہ بیان کرتے ہیں کہ جو موروثی وڈیرے اپنی طاقت کا استعمال کرنے سے قاصر ہوتے ہیں وہ انتظامیہ کی نظروں سے گزر جاتے ہیں اور پھر انہیں زیادہ مزن نہیں لگایا جاتا اور جگے سے جگے ہٹا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میری موجودگی میں ایک جوان وڈیرے ای۔ اے۔ سی (EXTRA ASSISTANT COMMISSIONER) کے پاس آیا اور شکایت کرنے کا۔ میری کوئی بھی نہیں سنتا، کیونکہ انتظامیہ میری مدد نہیں کرتی۔ اسے بتایا کہ اس میں قصور تمہارا ہے اور تم گزرتے

دھو تو بھان ہے کہ تمہاری بات تمہارے آدمی نہیں جب تمہارے آدمی تمہارے کہنے پر چلیں گے تو پھر انتظامیہ بھی تمہاری عزت کرے گی۔

اسی طرح موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ انتظامیہ کا ذہن نہ کچھ اس طرح سے ہے کہ حکومت کے نمائندے کے توسط سے طاقت قبائلی تمندار اور وڈیرے حاصل کرتے ہیں۔ پھر ایک وڈیرے کا تول دہرتے ہیں میں پولیس کی ایجنٹ صاحب کے جوتوں کی خاک ماف کرتا ہوں اور اس کے بدلے ہزاروں میرے جوتے ساف کرتے ہیں۔

ہم نے این فرسن صاحب کی کتاب کا حوالہ اس وجہ سے دیا کہ شاید ہماری بات کا یقین نہ کریں۔ جلیے باہر والے کو ہم سے کیا مطلب۔ اس نے جو دیکھا وہ لکھ دیا۔ دیے ہم بھی آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے جو اپنے کانوں سے سنا آنکھ سے دیکھا اور کتابوں میں پڑھا وہ ہی بیان کر دیا ہے۔ تجزیہ آپ پر چھوڑتے ہیں۔

تیسرا درجہ آتا ہے۔ جنب کمین / کم اصل یا غریب سیال کا یہ وہ طبقہ ہے جس میں دوم مرہٹا وہ لوگ شامل ہیں جو کہ پشتینی غلام تھے۔ یہ کم درجے کا کام کرتے ہیں۔ یعنی گانے بجانے کا زمینوں پر چلانے کا یا اس قسم کے اور کام۔ ان کے ساتھ آغاز سے ناروا سلوک ہوتا آیا ہے۔ آخر کو غریب کم درجے کے لوگ ہیں۔ اگر کوئی ان کی عورتوں سے شادی کر بھی لے تو اس کی اولاد کا نہ تو ورثہ میں کوئی حق اور پھر وڈیرہ یا سردار بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کم درجے کے لوگوں میں جت بھی شامل ہیں جو زیادہ تر اونٹوں کو چراتے ہیں۔

یہ حالات تو ہمارے دوستوں نے سرسری طور پر بیان کیے آگے چل کر اور وضاحت ہو جائے گی۔ اب ہمارے

دوست کہنے لگے کہ جب ایسے حالات ہوں تو ڈیرے سخت جوڑ توڑ میں لگ جاتے ہیں۔ ایک کو گھینا دوسرے کو بڑھا دیا۔ جب بات امن و امان اپنے علاقے میں قائم کرنے کی ہو تو پھر نئے نئے لوگ میدان میں آتے ہیں اور اپنا اپنا زور دکھاتے ہیں تاکہ حکام ان کی طاقت کو مانیں اور ان کی مدد کریں اور ان کو ڈیرہ بنادیں۔ لڑائی لڑ کر بڑبڑاتی ہے تو آپس میں کیا بات کی ہے انگریز والی۔ تو جناب ادھر تو کام ایسے ہی چلتا رہا ہے۔

ہمارے ننگرانی دوست بولے تو اسی قسم کی ایک سٹی میں جو خاندانی ڈیرے تو نہیں مگر سب نئے گڑے ڈیرے کئے پاتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کافی لوگوں کو تنگ کیا اور بہت سے پشتینی ڈیریوں کو نیچا بھی کھایا ان کے نام کو جانے دیں آپ اسٹارٹ ڈیرے کے نام سے ہی یاد کر لیتے ہیں۔ ماشاء اللہ تھوڑے بہت پڑے

میں یہی بات ہے کہ یہاں کے سرکاری ڈیرے نفع بخش ہیں یہ کمزوری اور کمزوری اور کمزوری سے بہت بڑا اسٹارٹ ڈیرے کے پاس ہے اسی وجہ سے اب رانی اس پر کچھ خوش نہیں ہیں۔ مگر معاملہ مجبوری کا ہے۔ جناب آپ اسٹارٹ ڈیرے صاحب نے وہ پارلیمنٹی راستہ اختیار کیا پہلے تو ایک منظم پارلیمنٹی مسئلہ یہی کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ سرداری کا ذرا ذور بھی کم ہو۔ پھر کچھ مظاہرے بھی کرائے۔ رشن ڈیریوں کے ذریعے نہیں بننا چاہیے بلکہ براہ راست دیا جائے۔

باقی ڈیریوں کا زور ذرا مضبوط تھا تو معاملہ آگے تک بڑھا۔ پھر اس پاس نگرانی اور مری علاقے سے باہر لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ اس عرصے میں غیر مالک کے چکر بھی لگائے پیسے بھی آنا شروع ہو گیا۔

۱۹۷۰ء کے اوائل میں مری علاقے میں سرداری تو قائم تھی مگر ایجنسی کا کام ایک سربراہ کو نسل چلائی

تھی جس کے نو نمبر ہوتے تھے۔ اس کو نسل کے سربراہ دو خان تھے جو موجودہ سردار صاحب کے چچا تھے زیادہ تر یہ کام پولیٹیکل ایجنٹ کی وساطت سے ہی کرتے تھے۔

ہمارے دوست بیان کرنے لگے۔ جب آپ اسٹارٹ ڈیرے کا زور زیادہ ہوا تو انہوں نے اپنے قبیلے یعنی بجا رانیوں کو ہمارے غل و بلبند کر دیں یعنی کہ جس بھڑوں پر ایک بھیڑ سردار کا ٹیکس بکھریں گے کیا فائدہ۔ یہ ٹیکس معاف کر دیا گیا۔ پھر ایسی ہی اور باتیں ہوتی رہیں اس عرصے میں آپ اسٹارٹ ڈیرے اور ان کے ساتھیوں نے زور آزمائی کی سوچی اور حکومت کے خلاف تیاریاں شروع کر دیں۔ باہر سے شہر لائے اور تربیت شروع کر دی۔

۱۹۶۳ء میں جب دودا خان کہان سے سچی جا رہے تھے، انھیں گھات لگا کر مارا گیا۔ ان کے ساتھ سربراہی کونسل کے تین اور وڈیرے تھے وہ بھی مارے گئے۔ تھوڑے عرصے بعد حکومت کا ایک ڈورز کہان کے پاس کام کر رہا تھا اُسے جلادیا گیا۔ اب حکومت سے پنجہ آزمائی شروع ہو گئی۔ آپ اسٹارٹ وڈیرے پیراڈ پر چلے گئے جب سرداری ختم کر دی گئی تو ان کا مفاد سرداری نظام کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ ۱۹۶۶ء میں ملیشیا اور پولیس کو اسن وامن قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

اس وقت مغربی پاکستان کا ایک ہی صوبہ تھا۔ کالا باغ صاحب گورنر تھے۔ دونوں جانب کافی نقصان ہوا۔ کافی فراریوں نے ہتھیار ڈال دیے مگر آپ اسٹارٹ وڈیرے ہاتھ نہ آئے۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو کچھ اور ہمارے مری دوست آکر بیٹھ گئے۔ جہاں ہمارے دوستوں کے بیان میں فرق آتا تو وہ ٹھیک کر دیتے۔

ہمارے مری دوست نے پھر بیان شروع کیا کہ تقریباً ایک سال تک یہی حال رہا۔ فراریوں کا اندر تقریباً نوٹ چکانا تھا کہ گورنر صاحب بدل گئے۔ نئے گورنر صاحب نے بیان دیا کہ چونکہ ان قبائلیوں کی طرف سے پڑوسیوں نے معافی مانگ لی ہے اور یقین دہانی کرائی ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ پھر سے وہی نظام قائم کیا جاتا ہے چنانچہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۷ء کو ملیشیا اور پولیس کو واپس بلا دیا گیا۔ حکومت کو ایسا واپس لایا گیا کہ پولیس تھانے بھی ٹرڈا دیے گئے۔ حکومت کے درمیان ایک اور حکومت قائم کر دی گئی اور آپ اسٹارٹ وڈیرے کوٹہ میں رہنے لگے اور انھوں نے کام بھی سنبھال لیا۔

اب جن لوگوں نے حکومت کا ساتھ دیا تھا یا ہتھیار ڈالے تھے ان کے جانور ضبط کر لیے گئے۔ عورتیں چھین لی گئیں اور ایسی عبرتناک سزائیں دی گئیں کہ آپ یہاں آکر خود ان لوگوں سے پوچھ لیں۔ جو لوگ ان تختہ بازی کا دیوبند میں شامل تھے وہ ہر دہن گئے۔ آئندہ جنگ کے لیے مزید تیاریاں کی گئیں۔ دوبارہ جب نظام بدلنے کی کوشش کی گئی تو اس کا احوال آپ کے سامنے ہے۔“

ہم نے اپنے دوستوں کے بیان کی تصدیق کافی جگہوں سے کی اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کیا ہوا دوست جب بیان ختم کر چکے تو کہنے لگے کہ جناب یہ نظام بدلتے بدلتے کافی دیر لگے گی۔ یہ دو تین سالوں کی بات نہیں ہے۔ صدیوں کی پسماندگی اور فرسودہ نظام کو جلد ختم نہیں کیا جاسکتا۔ سوال ختم کرنے کا نہیں بلکہ بدلنے کا ہے۔“





میان کوهستان و دریا



## جنگی رواج ایک جائزہ

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ انگریز مری قبائل کو طاقت سے زیر کرنے میں قیام ربا اور اس نے جوڑ توڑ کا طریقہ استعمال کیا۔ دراصل صدیوں سے رواج کچھ اس طرح کے ہیں کہ ہر ایک پیدائشی سپاہی بوتلمب۔ بلوچستان میں یاہوں کیسے کہ پورے پاکستان کے قبائل میں مری سے بہتر اور بہادر لڑنے والا کوئی اور قبیلہ نہیں۔ یہ آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے۔ آپ تائید پڑھ لیں۔ فن سپاہ گری میں یہ اپنا ثانی نہیں رکھتے آخر کیوں نہ ہو عرب خون ہے اور صدیوں سے ان کا حرف یہی کام رہا ہے۔ صدیوں کی عادت جلد ختم نہیں ہو سکتی۔ ان کے طور طریقے رتبے ہنر کے ڈھنگ۔ رواج سب اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اگر فرق آیا ہے تو سرداروں اور وڈیروں کے خاندانوں میں۔ عام آدمی تو بے چارہ جیسے پہلے تھا دیا اب بھی نہ پہنچا رواج پر سرسری بحث کہیں اور رکھی کریں گے مگر یہاں تفصیل سے ذکر کرنا مناسب ہے۔

### فنون لطیفہ:

پہلے فنون لطیفہ کی بات ہو جائے پینٹنگ وغیرہ تو کی نہیں جاسکتی مگر یہاں اس کا اپنا رنگ ہے اکثر لکڑی پر لکھی سی کھدائی کی جاتی ہے۔ اگر آپ سے کسی کو انس ہے تو وہ شاید آپ کو ایک چھڑی پیش کر دے

اس پھڑی پر پوری زندگی کی کہانی دہن ہوگی؛ پیدائش سے دمِ واپسی تک کی۔ نمایاں ترین بات جنتی مناظر ہوں گے کہ جنگ کس طرح ہوتی ہے۔ لڑائی اور مار کٹائی سے بھرپور۔ پھڑی پیش کرنے والے کو جتنا آپ سے انس ہوگا اتنے ہی لڑائی کے مناظر بھی محنت اور وضاحت سے پیش کیے جائیں گے۔ یہ کسی ہیرو کی کہانی ہو سکتی ہے یا پھر ایک عام مری کی زندگی۔ اس قسم کا آرٹ پھڑیوں تک اس لیے محدود ہے کہ لوگ گھر نہیں باتے دیواریں ندارد۔ جھگیاں چٹائی یا کبل کی ہوتی ہیں تو ان پر نقش کرنا ابھی تک انہوں نے سیکھا نہیں ہاں کہیں کہیں سردیوں سے بچنے کے لیے غار استعمال کیے جاتے ہیں بشرطِ مجبوری یا وقتی طور پر۔ ایسی حالت میں جگہ کو خفیہ رکھنا ضروری ہے تو وہ رہتی ہے کہ کوئی نشان نہ چھوڑا جائے:

بات گانے بجانے کی آئے تو جناب اس کو مری اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ کام تو ایک علیحدہ فرقے کے سپرد ہے جیسا کہ پاکستان کے دیگر علاقوں میں جنہیں مراثی کہا جاتا ہے۔ ساز تو یہاں خاص نہیں ہیں۔ سوائے ایک "نڑ" کے یا ایک سارنگی کی قسم کی چیز ہوتی ہے۔ وہ بھی بہت ہی کم "نڑ" ہی عام ہے۔ یہ ایک طرح کی بانسری قلی ہے مگر بانسری سے تین گنا لمبی موٹائی میں بھی یہی تناسب رکھ لیں۔ ٹھیک رہے گا۔ گانے والے کو مٹری کہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس لفظ کا تعلق "سُر" سے ہے یعنی یہ صاحب گانے کے ساتھ ساتھ "سُر" بھی دیتے ہیں۔ گانا طوماً ایک ہی لے میں ہوتا ہے اور بانسری کی بھی ایک جیسی لے برقرار رہتی ہے۔ گانے میں بہادری کی داستانیں ہوتی ہیں۔ عشقیہ طوماً کم ہی وہ بھی پرانے زمانے کی۔ ایک جگہ ہم نے سسی پنوں کا بلوچی ورژن بھی سنا۔ اس کا ذکر کہیں اور کریں گے۔ آٹنا یہاں پر بتادیں کہ بڑا ہی لطف آیا۔ بلوچی ورژن سندھی اور پنجابی سے ذرا مختلف ہے۔ گانے "شاعر" لکھتے ہیں۔ کیا ہنگ کی ہے شاعروں کی شاعر تو غزل کہتے ہیں۔ قصیدہ لکھتے ہیں۔ نظم میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آج کل تو فلمی شاعری میں گیت بہت عام ہیں۔ بات اردو یا کسی اور شاعری کی نہیں ہو رہی۔ یہ ذکر تو مری علاقے کا ہے۔ جی یہاں تو یہی کہا جاتا ہے کہ گانے "شاعر" لکھتے ہیں۔ شاعر کا رتبہ یہاں بہت بڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ شاعر کو خواب آتا ہے اور صبح بٹھ کر وہ گانے لکھ دیتا ہے۔ خداداد بات ہے جس میں الہام کو کبھی دخل ہے۔ میر جا پر سے بہت پہلے ان کے بعد اؤ حال کی بھی نظمیں ہیں۔ حال کی نظموں میں حالات کا بڑا دخل ہے۔ ایوب خان کے دورِ حکومت کی تو ابھی

خاصی مٹی پلید کی گئی ہے یا کروائی گئی ہے۔ اب ایک نظم کا مفہوم آپ بھی سن لیں۔ ایوب خان تم اچھے بادشاہ بنے ہو کہ کالا باغ کو نائب بنایا جو کہ بلوچوں کا جانی دشمن ہے۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے اس کو کم کرنے کے لیے خون بہایا جاتا ہے لیکن ہم بھی بڑے لڑاکا ہیں۔ جب جنگ شروع ہوئی تو ہمارے وڈیروں نے بھی جنگ کا اعلان کیا۔ ان کی بہنوں نے بہادروں کے سر پر ٹپک رکھی۔ ہتھیار سجائے اور گانا گاتے ہوئے رخصت کیا۔ میدان میں سرکاری فوجوں کے پرچے اڑا دیے پھر قیاب ہو کر گھر لوٹے ان کی بہادری کی داستان دنیا گاتی ہے یہ تو نمونے کے طور پر ہے۔ دورِ حاضر کے بارے میں بھی گلے بنے ہیں لیکن لوگ سنانے میں پکا پکاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ابھی تک ہمارے پاس پہنچے نہیں۔ کیا بات ہے؟ فلمی گانا ہو گا تو اس کے تعلق کہیں گے کہ ابھی تک ریکارڈ مارکیٹ میں نہیں آیا۔ بہت اصرار کرنے پر سننا بھی دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر مفہوم حاضر ہے؟ ہم مری ہمیشہ سے بہادریاں۔ ہماری بہادری کی گواہی یہاں کے پہاڑ اور وادیاں دیتے ہیں۔ ہم ہمیشہ سے اپنے دشمنوں پر غالب ہے۔ ابھی ہماری غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟ بڑی کوشش کی کہ بھائی کسی شاعر سے ملاقات کرادو مگر بے سود۔ ہاتھ کنگن کو آری کیا جا دودہ جو سر چڑھ کر بولے۔ جناب بیویں صدی ہے کوئی ان باتوں کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ ان لغو باتوں سے ترقی کو کب تک روکے شاعری بھی تم نے چڑھ لکھ کر بیسی کی ہے اب تو لوگ خود آتے ہیں کہ سول گھوڑو جہاں میں پھول کی جگہ ہے۔ وہاں پچاس ہوتے ہیں۔ سرکس بن گئی ہیں۔ بس بھی چلاؤ۔ اگر نہیں چلاتے تو ہمیں دو ہم خود چلا لیں گے۔ ڈاکٹر گھوڑوں نہیں ہیں۔ ہمارے بچوں کو پھلواؤ ہم خود اسپتال چلائیں گے تو جناب بات شاعری کی تھی شاعر لکے دیتے ہیں اپنی دھن میں۔ تب سے نہیں صدیوں سے ابھی تو زور کم ہے۔ جہاں مل ہوتا ہے وہاں رڈ مل کا ہونا جی ضروری ہے۔ یہ قانون حرکات کے بارے میں نیوٹن نے دریافت کیا تھا۔ تو اس کا اطلاق یہاں کی شاعری پہنچی ہوتا ہے۔ کچھ شاعری نسل کے بھی ہیں۔ وہ ترقی کو برا نہیں سمجھتے مگر ان کی رسائی ابھی تک کئے والوں تک نہیں ہوئی ہے۔ شاید ریڈیو اور ٹی وی والوں تک ہو جائے۔

گانے بجانے اور شاعری کے سلسلے میں یہاں کا ایک اور سنور بھی ہے۔ جب بھی کوئی جنگ پر جاتا ہے تو عورتیں اس کی شان میں قصیدے گاتی ہیں۔ قصیدے بھی شاعر ہی لکھتے ہیں۔ خواب بھی تو انہی کو آتے



ہیں۔ اگر کوئی بزدلی دکھائے تو جھجک بھی حاضر ہے۔ اب بھاگے کوئی میدان سے قیدے کے بُرے لگتے ہیں۔ جوانی کا خون گرم ہوتا ہے تو پھر ہر ایک مارنے مرنے کو تیار کہ لکھو ہماری شان میں قصیدے ہم بھی اپنے جوہر دکھاتے۔ پھر جو بھی ہے لڑائی کا دیوانہ۔ علی گل ٹھنگیانی، شاد نواز، حیدر جوا اپنے زمانے کے ملے ہوئے لڑاکا ہیں انہیں جب اپنے ساتھ شاننگ سے لائے تو ان کے ساتھیوں سے کہا کہ نمونے کے طور پر اور کچھ ہماری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ایک آدھ قصیدہ ہمیں بھی سناؤ۔ پہلے تو تکلف کیا۔ پھر سنایا اور خوب سنایا۔ اب تو معافی لے دو پرانی باتیں دل سے نکال دو تم نے کہا تھا تو سنائیے۔ یہ تو بوجہ انگریزی زبان اور فوجی اصطلاح میں موٹیویشن (MOTIVATION) کا طریقہ۔ اسے جوش دلانے کا "رواج" بھی کہہ سکتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بھی رجز پڑھے جاتے تھے۔

اب نظر ڈالیے یہاں کی تنظیم پر۔ یہ تنظیم امن اور جنگ کے لیے نہایت موزوں لیکن آج سے سو سال پہلے کے لیے۔ مگر دورِ حاضر کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دل کو نہیں لگی۔ اسلامی اخوت، جمہوریت، سماج و معاشی انصاف اور مساوات کے چکاچوندِ معمول کے سامنے ویسے بھی یہ نظام کہاں ٹھہر سکتا ہے بلکہ خائبہ! اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اب بھی دانستہ یا نادانستہ کچھ لوگ اس نظام کی حامی بھرتے ہیں۔ ایسے ویسے نہیں پڑتے لکھے۔ چلیے مذہبی ذاتی مفاد کی خاطر ہی سہی۔ وہ بھی انکسٹن کے تعلیم یافتہ تنظیم کا بھی پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ مگر جب جنگ کی بات آگئی تو تمھواری سی وضاحت ہو جائے سب سے پہلے تمہیں خبر سردار کا پھر تمہن دار اپنے قبیلے کا سب سے بڑا بزنل ہے۔ ہر لحاظ سے اپنے قبیلے کی حفاظت، انسانیت، اندرونی اور بیرونی جنگی معاملات کی گتھیاں یہی سلجھاتا ہے۔ تمہن دار کی مدد کے لیے مقدم ہوتے ہیں جو تمہن دار کی مدد کرتے ہیں اور اپنے اپنے فرقے یا جزوی قبیلوں کے مالک۔ ان کے بیچے و ڈیرے۔ یہ بھی اپنے چھوٹے حصوں کے مالک ہوتے۔ تمہن دار، مقدم اور وڈیرے کی حکومت موروثی ہوتی ہے۔ اگر اولاد نہ ہوئی تو نیا ہمدیدار قبیلہ چن لیتا ہے اور اس کے سرپرستی رکھی جاتی ہے۔ تمہن دار اور مقدم بیٹھ کر صلاح مشورہ کرتے ہیں کہ جنگ کس طرح کی جائے اس کے بعد ہر ایک جزوی قبیلہ سپاہی اور کمانڈر مقرر کرتا ہے اور قوم لڑائی کے لیے تیار ہو جیسے وڈیرے کے نیچے مغترب بھی ہوتے ہیں یریلوں کے جہاں اور قبیلے ہیں وہاں ایک خاص قبیلہ ہوتا ہے جو اب بھی ہے

مگر اب بات وہ نہیں رہی۔ انھیں سہزن کہا جاتا ہے۔ اس قبیلے کو خون بہا معاف ہوتا تھا۔ یہ لوگ جنگ کے دوران پیچھے بیٹھتے تھے تاکہ اگر کوئی میدان چھوڑ کر بھاگے تو اسے موقع ہی پر سزا دی جاسکے۔ سزا صرف ایک یعنی گردن اڑا دی جاتی تھی۔

شاموں، تمنداروں، مقدموں اور وڈیروں نے سردھڑ کی بازی لگائی کہ عہدے برقرار رہیں۔ مگر پرانا نظام پھر پرانا نظام ہوتا ہے۔ تمندار، مقدم اور وڈیرے قائم تو رہے مگر جو بھی نکلنا ہوا جنگ میں بہادری دکھائی۔ تھیایا اپنا عہدہ۔ یاد لوگوں نے بھی آدمی نکلنا دیکھا۔ ہو گئے خاموش۔ آپس میں کبھی بات وہ نہ رہی۔ مگر کچھ بات تو رہی۔

جہاں لوگ اس نظام کو بیا کہتے ہیں اور صرف وڈیروں کو بے نقطہ سنانے کو اپنی ذمہ داری خیال کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ تھوڑی بہت زیادتی کرتے ہیں۔ قصور ہم سب کا ہے۔ اگر قصور ہم سب کا نہ ہوتا تو حالات کی یہ نوبت کیوں آتی۔ اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے یعنی صرف دو سال پہلے ہی کے حالات لے لیں۔ بُری سے بُری بھی یادداشت ہو تو بھی دو سال تک تو ساتھ دیتی ہے۔ ہر کیس اپنی عداوت۔ دشوار گزار تنھانے غائب، غریب آدمی کو تو حفاظت پناہ ہے۔ حفاظت اپنی جان مال اور بیوی بچوں کی۔ آپ کو حلو کے بالکل جنوب کی جانب دیکھیں تو جندران کا پہاڑ ہے۔ اس کی بلندی چھ ہزار فٹ ہوگی۔ اوپر جاتے جاتے ہی سارا دن لگ جاتا ہے۔ دو سال پہلے یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جندران میں کافی آبادی ہے۔ اب کوئی کسی کی بیوی بچہ نہیں لے۔ مال لے جائے جو کہ ملو ما ہوتا ہے یا آپس کے جھگڑے ہیں تو غریب دار فریاد کہہ لے جائے۔ جمہور وڈیرے کا سہارا۔ پھر وڈیرہ تو اپنی فیس لے گا۔ جو جتنی بہتر حفاظت مہیا کرے اتنا ہی بڑا آدمی۔ تو جناب سوسائٹی کی تشکیل ہی اسی طرح ہے۔ آپ وڈیروں کو ہٹا دیں تو خلا رہ جائے گا۔ خلا سے اور گڑ بڑ ہوگی۔ اس کا علاج یہی ہے کہ وڈیروں کی جگہ پکا انتظام قائم ہو جیسا کہ کیا جا رہا ہے۔ دیر تو لگے گی مگر کوئی اور چارہ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی و زرعی ضروریات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تعلیم پھیلانے کی رفتار کو بھی تیز کیجیے۔

سوداگر، تمندار اور وڈیرے کیسے اپنی میراث کو چھوڑیں۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں۔ پڑھائی اپنی جگہ پنا

مفاد کہے پیارا نہیں ہوتا۔ مفاد اور پھر میں ہمیشہ سب سے پہلے عام آدمی جائے بھاڑ میں جب ذاتی بات ہو تو سودھڑ کی بازی بھی جانتا ہے۔ کچھ نے لکائے غیر ملکوں کے چکر واپسی پر شیر بھی لائے آج کل دنیا بہت چھوٹی ہے ہر ایک پٹے میں ٹانگ اڑانے کو تیار۔ حالات بھی سازگار۔ کیوں نہ فائدہ اٹھا جائے۔ وہ بدو جنگ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں لڑائی ایسے کہ جائے کہ اپنی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں اور دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ۱۹۷۲ء میں کیپ کولے گئے۔ تربیت ہوئی۔ علاقے بانٹے گئے اب اس قسم کی تخریبی کارروائی کے لیے معلومات حاصل کرنا اور اپنی معلومات کو چھپانا اہم ہوتا ہے یہ بھی فردی ہے کہ رسد اور اسلحہ کی فراہمی کا بندوبست بھی درست ہو۔ کام سوچ گئے جو پڑھے لکھے تھے وہ "قراری" بنے جو لڑنے والے تھے وہ "قراری"۔ "قراری" اور "فراری" یہ تیری اصطلاح نہیں۔ بیسیں کی انتہا آج "قراری" وہ تمندار مقدم یا دیرے تھے جن کا کام یہ تھا کہ ظاہر اہم حکومت کے وفادار مگر کوشش یہ کہ نظام تبدیلے اور رہے ہماری تحائفداری معلومات رسد اور اسلحہ فراہم کرنا ہمارا کام ہے۔ یہ بھی تو مشکل بات ہے کہیں سے پیغام فراریوں کے لیے آئے اس کو پہچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ جب شروع شروع میں آئے تو جناب علاقے کے وڈیرے ہیں کہ پہچان نہیں چھوڑتے۔ وفاداری کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں حکومت کی شان میں قہیدے پڑھے جا رہے ہیں اور فراریوں کو گالیاں۔ ہر ایک یہ سمجھے گا کہ ان سے زیادہ وفادار کوئی نہیں۔ خیر یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ سب ہی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کافی سے زیادہ ہمدرد بھی تھے اور ہیں اور سب لوگوں پر الزام دھرنا بھی بے جا ہوگا مگر فوراً کیجئے۔ پہلے ہی حکومت آئی اور واپس گئی۔ وفاداروں کے ساتھ کیا ہوا وہ انہیں سے پوچھیے حکومت کے جانے کے بعد بیویاں چھپنی لگیں۔ مال ضبط ہوا جب ماتھا رکھا تو چیزیں واپس ملیں۔ دوسرے یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ جب تک مکمل حفاظت نہ ہو تو کیسے ایسی سوسائٹی میں لوگ وڈیرہ شاہی نظام کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ کچھ تو رنگے ہتھولہ پڑے گئے۔ مجبور کہیں تو کیا کہیں۔ اب خیر سب گہرے دوست ہیں۔ اس وقت یہ ہوا تھا۔ مجبور تھے کیا کرتے۔

اب فراری تو خیر فراری ہوئے مطلب اور مفہوم ظاہر ہے۔ فراری وڈیرے اپنے اپنے علاقوں میں تخریبی

کارروائیوں کے ذمہ دار۔ اُدھر "قراریوں" سے خبر ملی اور اُدھر کارروائی کو عمل میں لائے۔ رسیدیا اسلحہ کی ضرورت ہوئی "قراری" عملدیکار۔ اگر کوئی "قراری" پکڑا لیا۔ اب قراری ہیں کہ چکر لگا ہے ہیں خدا اور رسول کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں اور آپ کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ یہ بے گناہ ہے۔

کسی قسم کی بھی جنگ، جو خبر کا صحیح اور تیزی سے پہنچا ضروری ہوتا ہے۔ ایک انگریز جنرل کی کتاب "نظر سے گزری" موصوف اس علاقے میں نوکری کر چکے ہیں۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب وہ بن میں مقیم تھے اور اور انگریز فوج کا ایک دستہ کو صلو کی جانب گیا۔ واقعہ مری قبائل کے ذریعہ خبر موصول ہوئی کہ آج سچ انگریز فوج کو شکست ہوئی ہے۔ چارائسہ اور پیاس جوان مارے گئے۔ صاحب بہادر "پہل پڑے" کہ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جہاں جنگ ہوئی ہے وہاں سب سے کم دو دن کا راستہ ہے۔ اتنی جلدی خبر کیسے پہنچی یقین نہیں آیا۔ لکھتے ہیں کہ دو دن بعد فوجی ذرائع سے خبر پہنچی۔ دونوں کی "ملیمات" ایک جیسی تھیں۔ اب کچھ بات۔ یہ تقریباً سو سال پرانا واقعہ ہے۔ خبر سانی کا ان کا یہ طریقہ صدیوں پرانا ہے قصہ پڑھ کر بھی کچھ تعجب ہوا کہ لکھنے والا بالکل آرائی کر رہا ہے۔ کتابیں اور بھی پڑھیں۔ جب دوستی مری بھائیوں سے زیادہ ہوئی۔ دران کے ساتھ اٹھنا بیٹھا عام ہوا تو عقدہ کھلا۔

مری قبائل میں خبر پھیلنا ایک رول ہے اور کچھ نہیں ہے ہر ایک کو اس کی نزہت دی جاتی ہے۔ جب کبھی بھی کوئی راستے میں ملتا ہے یا سفر کر کے آتا ہے ایک سبک کے بعد پہلا سوال ہوتا ہے کہ "حال دے" آنے والا پورا حال دیتا ہے۔ جب آنے والا اپنی روداد ختم کر لیتا ہے تو دوسرے سے یہی سوال کرتا ہے۔ "تائیں حال دے"۔ وہ بھی اسی طرح حال بیان کرتا ہے۔ سب سے پہلا خبر مشہور ہوتی ہے۔ حال دیتے وقت کوئی اہم بات نغرا نما نہیں کی جاتی ہے۔ نئے ذائقے کو اگر کہیں وضاحت طلب ہو یا بیان تشنہ رہ جائے تو وضاحت بھی طلب کر لی جاتی ہے۔ حال دینا ایک ایسا رواج ہے کہ اگر اسے پورا نہ کیجئے تو دشمن کے حاکم کا سیل لگ جاتا ہے اور جاسوس کی سزا تو آپ کو عظیم یعنی مرگام۔ 'حال' میں بیویوں یا کسی عورت رشتہ دار کا ذکر نہیں ہوتا یہ حوالہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو اپنے بے تکلفی سے باعث اپنے مری دوستوں سے ملتے بی پوچھنے لگے کیسے بگیم صاحبہ اور بچے خیریت سے ہیں۔ ہمارے دوست ہفتے مگر بڑا مانتے ایک روز



ایک دوست کہنے لگے "شاہ صاحب ہم تو آپ کی عادت سے واقف ہیں۔ ویسے بھی آپ نیدر ہو مگر ہمارے ہاں بیوی اور بچوں کا حال نہیں پوچھا جاتا" "بھئی آخر کیوں یہاں کی تمام عورتیں ہماری مائیں نہیں یا بیٹیاں ہیں۔ ہم تو معلوم کریں گے" "آپ کی مرضی ویسے آپ سے اتفاق ہے بس رواج نہیں۔ ہمارے ہاں عورت کی اہمیت ہی نہیں"

حال عموماً ایک خاص ترتیب سے دیا جاتا ہے۔ اس میں تھوڑا بہت رد و بدل بھی ہو سکتا ہے حال لینے اور دینے کی ترتیب عموماً یوں ہوتی ہے۔

ا۔ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ کس غرض سے جا رہے ہو؟

ب۔ راستے میں کس کس سے ملاقات ہوئی؟ انھوں نے کیا کہا اور تم نے کیا کہا؟

ج۔ حکومت کی کارروائی۔

د۔ قومی بائیں یعنی آپس کے جھگڑے یا تصفیہ۔

و۔ عام چیزوں کے بھاؤ۔

م۔ فصل اور مال

ذ۔ بارش اور گھاس

ڈیرہ علی گڑھ جب نظر بند ہوئے تو ان کے گھر والے وادی گریزی میں واپس آگئے فرار ہونے سے پہلے وہ یہیں رہتے تھے۔ وہاں میں کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ ان کے صاحبزادے بہار خان جن کی عمر تقریباً سات آٹھ سال ہوگی۔ ملے۔ ضد کرنے لگے کہ باپ سے ملا دو۔ جلدی جلدی نیا رہو کہ جیب میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ماشاء اللہ بہت ہی ذہین ہے اللہ کرے کچھ بڑھ لکھ جائے۔ کوہلو پہنچ کر ان کی خواہش پوری کر دی۔ سلام دے کے بعد وہ یہی بات یعنی "حال دے" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر لگا دیا ہو۔ بچے نے بولنا شروع کیا۔ آپ بھی سن لیں۔ گھر میں سب خیریت ہے۔ جانور ٹھیک ہیں سوائے دو بھیروں کے۔ اونٹ جو گم ہو گئے تھے مل گئے ہیں۔ راشن ٹھیک مل رہا ہے مگر سلیمان نے سنی دیتے وقت بے ایمانی کی تھی اس وجہ سے چائے بناتے ہوئے کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ دونوں ماؤں ہیں آج کل

سلحہ ہے۔ پڑوس میں سیدا کا حلقہ بھی پہنچ گیا ہے۔ باقی ٹکیانی بھی واپس آرہے ہیں۔ شاہ نواز کے گھر والے شام تک پہنچ جائیں گے۔ شاہ صاحب تقریباً دوپہر کو ہمارے گھر پہنچے۔ اس کے ساتھ دو اور فوجی گاڑیاں تھیں۔ ہر ایک گاڑی میں دس دس آدمی تھے، سب کے پاس ہتھیار تھے۔

شاہ صاحب بغیر ہتھیار کے تھا۔ گھر سے دور ہتھیار والے نیچے اترے۔ انہیں اس نے گاڑی میں اپس بٹھا دیا۔ پھر اکیلا گھر آیا۔ سب کی خیریت پوچھی۔ میں نے اس کے ساتھ آنے کی ضد کی اور وہ مجھے ساتھ لے آیا۔ واپسی میں یہ لوہار کی ٹمک رکھا۔ وہاں فوجی کیمپ ہے۔ اس جگہ کچھ لوگ وردی میں تھے۔ باقی شہزاد قیس میں کیمپ میں ہم نے چائے پی اور کھانا کھایا۔ راستے میں "کبا وانگا" پر فوجی پکٹ تھی۔ نیچے چار آدمی تھے جن کے پاس ہتھیار تھے۔ انہوں نے صاحب کو سلام کیا اور ہم سب کو پانی پلایا۔ راستے میں ایک مرد اور عورت بارہ تھے جو کہ پوادی تھے۔ شاہ صاحب نے ان کی خیریت پوچھی۔ عورت بیمار تھی۔ انہیں بھی گاڑی میں بٹھالیا۔ پوادی خیر محمد نام بتاتا تھا۔ اس کا علاقہ نہاڑ کے پاس ہے۔ پوادی بھی پہنچ گئے ہیں انہیں بھی انٹرنیٹ مل رہا ہے۔ شٹانگ میں ان کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ صرف کچھ بھیر میں کم ہیں میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے باپ نے ملنے کو جھلو جا رہا ہوں۔ کو جھلو پہنچ کر صاحب نے انہیں ڈاکٹر کے سپرد کر دیا۔ گریز میں ابھی گھاس کم ہے۔ بارش کافی عرصے نہیں ہوئی۔ یہ تو میں نے غنقر کر کے لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچے ستر رہا ہے اور حافظہ ہے کہ بھٹکنے کا نام نہیں لیتا۔ جب بچہ حال ختم کر چکا تو باپ سے کہنے لگا: "تمہیں حال دے۔ اس حال" کے رواج سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ یہاں خبر کتنی تیزی سے اور صحیح طور پر آنا فائنا پھیل جاتی ہے اور پھر پورا علاقہ ہوشیار اور خبردار۔

اب ذرا ان کی بہادری کے معیار پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ بہادری کا معیار یہ لفظ تو خود ان کا ہے۔ اگر اس کی جگہ بہادری کا "رواج" رکھا جائے۔ تب بھی غیر مناسب نہیں ہوگا۔ چلیے معیار ہی رہنے دیتے ہیں۔ جتنا بھی خوب ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کچھ RULES OF HONOUR ہی ہو سکتا ہے۔ اس رواج اور معیار کے سب پابند ہیں۔ اس کا ذکر یہاں اس وجہ سے مناسب سمجھا کہ جب جنگ کی بات ہو رہی ہے تو معیار کی کئی بات ہو جائے۔ یہ رواج بھی صدیوں سے چلا آ رہا ہے جو درج ذیل ہے:

، خون کا بدلہ خون۔ اس میں کوئی رعایت نہیں۔ پکا اسلامی قانون۔ صحیح بھی ہے کہے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف ہو۔ اندرون قبیلہ تو انصاف کافی حد تک ہوتا ہے لیکن اگر خون کا جھگڑا کسی اور قبیلے کے ساتھ ہے اور قاتل کی نشاندہی نہ ہو سکے تو فریق مخالف کا جو بھی فرد ہتھے چڑھ گیا۔ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مطلب یہ کہ ایک کے بدلے ایک اور دس کے بدلے دس۔ خون کا بدلہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بات دل کو نہیں لگی کہ جو سامنے آئے اُڑا دو۔ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ بدلہ ہمیشہ واجب الادا چاہے دشمن کی تلاش میں دس دن گزر جائیں۔ فیصلہ سہی ہو جاتا ہے اگر "شرعیّت" یا "قرآن" ہو جائے۔ "شرعیّت" یا "قرآن" کرنے سے یہ مطلب ہے کہ جرگہ کیا اور جو بھی جرگے نے فیصلہ دیا۔ اس کی پابندی کے لیے فریقین قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہیں کہ وہ فیصلہ کے پابند رہیں گے۔

ب : اگر کسی کو امان دی گئی تو چاہے ہاں ہی جائے آن قائم رکھی جاتی ہے۔ یہ بہادری کی نشانی ہے امان ہر ایک کو دی جاسکتی ہے بشرطیکہ آدمی یا عورت سیاہ کار نہ ہو۔

ج : امان صرف جان ہی کی نہیں بلکہ مال کی بھی ہوتی ہے۔ مجال ہے کہ امانت کو کوئی اور ہاتھ تو لگالے ہمارے ایک بچے مری دوست ہیں ایک روز بکریوں کی افزائش کا ذکر کرنے لگے تو ہم نے تذکرہ کہا کہ شکر گڑھ کی بکریاں قذا اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ سوچ کر بولے کہ اگر ایک جوڑا مل جائے تو ہم کوشش کریں گے کہ ابھی نسل نکالیں اس میں کوئی شک نہیں۔ بھیر اور بکری کو یہ لوگ بڑی محبت سے پالتے ہیں اور ان کی نسل کی افزائش میں کافی حد تک ماہر ہیں۔ میری بچی کو جانور پالنے کا بڑا شوق ہے سیالکوٹ سے بکری کے دو بچے اپنے ساتھ لائی تھی ہم نے بچی کو بتایا تو اس نے بعد خوشی بکری کے بچے بھیج دیے۔ رُہ ہم نے اپنے دوست کے حوالے کر دیے۔ دوست یہ سمجھے کہ یہ امانت ہیں ایک روز ایک عورت اور اس کے دو بچے شام کو ہمارے پاس آئے موجود ہوئے۔ دو امیں اور زارو آنسو کیا ہوا۔ بکری کا بچہ گم ہو گیا ہے اور وہ عورت کے خاوند کی سپردگی میں تھا تو حجاب نوش دے دیا گیا کہ اگر صبح تک بچہ نہ ملا تو خاوند کی خیر نہیں۔ بھاگے دوست کے پاس "بھائی ظلمت

کرد۔ "یہ ظلم تو نہیں یہ ہمارا رواج ہے۔ امانت کیسے گم ہو سکتی ہے۔" بابا امانت کدھر تھی تمہیں  
مخفیہ دیا تھا۔ تب جا کر معاملہ رفع دفع ہوا۔ ویسے بکری کا پڑہ دو دن بعد مل بھی گیا۔

د : جنگ چلے کتنی ہی شدید ہو۔ دشمنی چاہے کتنی سنگین عورت، بچے اور ہندو کو کچھ نہیں کہا جاتا۔  
عورت بچے کی بات تو سمجھ میں آگئی۔ ہندو یہاں کافی آباد ہیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ روکنا داری اور  
کاروبار کرتے ہیں۔ مریوں کے نزدیک یہ گھٹیا لوگوں کا پیشہ ہوتا ہے لڑاکا لوگ کب اس لغو بات  
میں پڑتے ہیں تو پھر کم درجے کے آدمی پر ہاتھ اٹھانا بھی تو بہادری نہیں۔ بات بھی درست۔

ر : حریف کے گھر سے اگر کوئی عورت دوہائی دیتی ہوئی آجائے تو اس کا قصور معاف کر دیا جاتا ہے لیکن  
یاد رہے جھگڑے کا تعلق سیاہ کاری سے نہ ہو۔ یہ تو عوام کی بات ہوئی۔ مگر آج کل کے وڈیرے یا یوں کہہ  
لیجئے جو زبردستی کے وڈیرے بن گئے ہیں اور خیر سے بیرونی سفر بھی کر آتے ہیں وہ ان رسومات کے  
اتنے پابند نہیں۔ اس قسم کی ایک بستی ہیں ان کا قصبہ ہر ایک مری کو معلوم ہے۔ اگر آپ کہیں تو کتنی ہی شہادتیں  
مہیا کی جاسکتی ہیں کیونکہ یہاں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہتی بحالہ ایک دم چلتا ہے۔ دکر آپ اشارت  
وڈیرے کلبے۔ جس کا تعارف ہم نے پہلے کر لیا ہے۔ وڈیرے زبردستی کے بن گئے ہیں۔ پیسے تنہا ہار گئے  
اور زور دیکھایا۔ ان کا جھگڑا ایک مہوند کے وڈیرے سے ہو گیا۔ یہ غریب۔ جب پہلی مرتبہ ۱۸۱۲ء میں  
حکومت کی تو سرکار کا وفادار بن گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ حکومت اگر جا بھی سکتی ہے۔ بدلتا خون  
کی واپسی ہوئی تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ مری رواج کے مطابق کلام مجید اور اپنی بیوی کے ساتھ حاضری  
دی اور عافی چاہی جواب ملا خدا کو میں نہیں مانتا بندوق یہ اڑھایا اور گولی میرا قاتل۔ اس آپ  
اشارت وڈیرے کو جانے دیجئے عام آدمی کی بات کرتے ہیں تو بھی یہ رواج قائم ہے۔

م : جنگ کے دوران مندرجہ ذیل باتیں نہیں اٹھایا جاتا

۱ : اگر عزم کسی نیرت کی حدود میں داخل ہو جائے۔ یہ بندش صرف حدود کی حد تک ہے۔

۲ : اگر حریف منہ میں گھاس رکھ کر آجائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہار مان لی  
گئی ہے۔ اکثر منہ میں مٹی بھر کر سبھی سامنے آ موجود ہوتے ہیں کہ قصور معاف کر دو۔



۳ : معافی مانگنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ پکڑی بجائے سر پر پینے کے گلاس بھی لپیٹ لی جاتی ہے۔

۴ : عام اور سادہ طریقہ ہر ماننے کا یہ ہے کہ سامنے زمین پر ہتھیا رچیٹنگ دیے جاتے ہیں۔

۵ : آج کل کے ماڈرن طریقے کے مطابق سفید جھنڈا کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جھنڈا اگر نہ ہلا تو کوئی بھی سفید کپڑا اونچی جگہ کھڑے ہو کر زور زور سے ہلادیا جاتا ہے۔

۶ : اگر کوئی عورت اسید بندو یا کوئی بھی شخص سر پر کلام پاک رکھ کر بیچ بچاؤ کے لئے درمیان میں آجائے تو جنگ چاہے کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو ایک دم بند کر دی جاتی ہے۔

۷ : زانی کی سزا ہمیشہ موت ہوتی ہے بشرطیکہ یہ حرکت ہم پتہ فرقے کے ساتھ کی گئی ہو بات دل کو نہیں لگی۔ جرم تو پھر جرم ہے۔ وڈیرہ کی طرح غریب بھی تو انسان ہوتا ہے۔ بس رواج ہے۔







« خَلَق »

## جنگِ تدابیر

جنگِ رواں کا بازو تو آپ نے پڑھ لیا۔ اب اسی پس منظر میں ان کی جنگِ تدابیر کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان حالات اور ماحول میں اس سے بہتر تدابیر نہیں ہو سکتیں۔ ایسا ہو بھی کیوں نہ۔ یہ آج کی بات تو نہیں صدیوں کا ورثہ ہے۔ مہوند کو علو سے تقریباً پچاس میل پر واقع ہے اور یہ جگہ مری علاقے کے وسط میں ہے۔ یہ ذکر اس وقت کہے۔ جب کو علو مہوند سڑک بن رہی تھی مگر فوجی گامیں آجا سکتی تھیں۔ علاقہ غیر محفوظ ضرور تھا۔ اس سڑک پر اکثر حادثات رونما ہوتے ہیں میں شام کو مہوند ٹہلنے کے لیے نکلا۔ یہ کچھ عادت سی ہے کہ اگر دروازہ نہ لگ جائے تو طبیعت مفعول ہو جاتی ہے۔ شام کو ذرا چپل تکی کر لی۔ لوگوں سے مل لیا۔ اس طرح نیند بھی اچھی آتی ہے۔ مجھے ایسا دیکھ کر ایک مری دوست بھی ساتھ بولے کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر کیم خاموش چپل قدمی جاری رہی۔ سوچ کر بولے آپ کو پتہ ہے کہ شیر کتنا بہادر جانور ہے۔ جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے جب سوتا ہے تو ایک کان زمین پر رکھ کر۔ بڑا غور کیا کہ اس جملے کا موضوع گفتگو سے کیا تعلق۔ اچانک یہ بات ان کے ذہن میں کیوں آئی؟ دوست یہ جملہ کہہ کر پھر خاموش ہو گئے۔ ہمارا تجسس بڑھا۔ بھائی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کہنے لگے کہ "شیر زمین پر ایک



کان اس لیے رکھ کر سوتا ہے کہ اگر کوئی دشمن قریب آتا ہو تو اسے آہٹ پہنچ جائے۔ یہ بہادری نہیں کہ اکیلا آدمی اس ماحول میں اس طرح گھومتا پھرے۔ آپ کے کندھوں پر بڑی ذمہ داری ہے۔ احتیاط ہمیشہ لازمی ہے۔ دشمن اس وقت وار کرے گا جب کہ قطعاً آپ کو اس کی آمد نہ ہوگی۔ بات سولتانے کمری تھی ”جناب آپ جو ہمارے ساتھ ہیں میں نے فوراً جواب دیا ”ہم تو آپ کو اکیلا دیکھ کر آگئے۔ آپ نے کون سا ہمیں بلایا تھا“ صفائی کرتے نہ بن پڑی۔ ہمارا اکیلا ٹھلنا کوئی بہادری کی بنا پر نہ تھا۔ بس خیال ہی نہیں آیا۔ بہادری اور ہمت۔ من آنم کہ من دانم۔ الشپاک پردہ رکھے۔ آئین ثم آئین اس چھوٹے قصبے میں مری جیگی تائیر کا فلسفہ مضمر ہے۔ بلکہ کافی حد تک فن سپاہ گری کی کامیابی اسی راز میں پنہاں ہے۔ کھلی سوچنے کا مقام ہے۔ جب بھی کوئی یہاں کارروائی کرتا ہے تو یہ قصہ ہم اسے ضرور سناتے ہیں۔

جنگ لڑنے کے اصول ہوتے ہیں جنہیں انگریزی میں PRINCIPLES OF WAR کہا جاتا ہے دنیا کی تمام افواج کے اپنے اپنے اصول ہیں۔ ویسے سارے ہی مشترک ہیں بس اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے۔ یار لوگوں نے کچھ گھڑائیے کچھ بڑھادیے۔ لفظ تبدیل کیے۔ مفہوم ایک ہی رہا۔ ان اصولوں کی بات چھوڑیے بات یہاں کی کیجئے یہاں کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے اپنے اصولوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ یہ اصول کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ لڑائی جہاں تک ممکن ہو اپنے علاقے سے باہر ہونی چاہیے۔ مطلب یہ کہ اگر گھات لگانی ہو یا چھاپہ مارنا ہو تو اپنے علاقے سے ہٹ کر دوسرے قبیلے کے علاقے میں کیا جائے۔ ان کی زیلہ تہ وارداتیں اپنے علاقے سے ہٹ کر ہی ہوتی ہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کا اپنا ایک پرانا رواج ہے جس کا ہر ایک سختی سے پابند ہے۔ اگر کسی علاقے میں کوئی واردات ہو جائے تو جس کا گھر نزدیک ہوتا ہے یا واردات کرنے والوں کے جہاں کہیں بھی سُرنگ کے نشان ملتے ہیں وہاں کے لوگوں کو کپڑا بجاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یا تو تم چور ہو یا چور کو کپڑا کر دو۔ ان کے اکثر ڈیڑھ آپس کے جھگڑے اسی اصول پر طے ہوتے ہیں۔ جب سُرنگ رسانی کی بات شروع ہو ہی گئی ہے۔ تو ذرا اس کی وضاحت کر دی جائے۔ روایت کے مطابق ہر ایک اس کام میں ماہر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو خدا کا

چیز ہے اس کے ایک ملے ہوئے ماہر ہمارے بڑے جگری دوست ہیں۔ ان کا نام میر ہزار خان کنگرازی ہے۔ یہ اپنے فرقے کے وڈیرے بھی ہیں ماشاء اللہ ساتھیوں بھی ہیں۔ ان کا تعلق سرانگری سے نہیں ہے۔ ہزار خان کا کہنا ہے کہ جب تک میراول نہ کہے میں یہ کام نہیں کرتا۔ کریں بھی کیوں؟ یہ ان کا پیشہ نہیں ہے۔ بلکہ مشغلہ ہے۔ یہ قدموں کے نشان دیکھ کر سال بھر ہزاری بات کا بھی سراغ لگا سکتے ہیں۔ ان کا ایک واقعہ ہے کہ کوہلو کے اسسٹنٹ کمشنر کہیں کام سے گئے تو انہوں نے جنگل میں کیمپ لگایا۔ ساتھ میں میر ہزار خان بھی تھے۔ ہزار خان نے زمین پر کچھ دیکھا اور کہنے لگے ”آپ نمبریں میں ابھی آتا ہوں“ تموڑی دیر بعد ایک چاندی کا پیالہ لیے واپس آئے پتا چلا کہ سال بھر پہلے مال چرائی کے سلسلے میں یہاں کیمپ لگایا تھا۔ اس وقت ان کا چاندی کا مکمن رکھنے کا پیالہ گم ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس وقت گیدڑ کے پیر کے نشان دیکھے۔ اور کھوج لگاتے لگتے پیالہ لے آئے۔ ان کے اور بھی واقعات مشہور ہیں۔ جہاں ایسے لوگ ہوں وہاں حریف کا پیچھا کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ جنگ یہ تو قدروں کے نشان دیکھ کر یہ سب بتا سکتے ہیں کہ آدمی کا علیہ کیا ہے اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ ذکر پہلے جنگی اصولوں کا ہو۔ اتنا کہ جنگ جہاں تک ممکن ہو اپنے علاقے میں نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی ایک وجہ بیان کر دی گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اپنے علاقے میں جنگ ہو تو زیادہ نقصان بھی اپنا ہی ہوتا ہے۔ گناہ گار اور بے گناہ دونوں ہی پھنستے ہیں اور پھر مال علیلہ برباد ہوتا ہے۔ قیسی اہم بات یہ کہ جارحانہ کارروائی باہری ہونا کہ لڑائی اپنے علاقے میں نہ پیل سکے۔ یہ تو مافی ہوتی بات ہے کہ جارحانہ کارروائی ہی سے تسلی بخش دفاع حاصل ہو سکتا ہے یعنی (OFFENCE IS THE BEST DEFENCE) لڑائی لڑو تو دوسرے ملک میں یہ تو امیر تموڑی کا بھی زریں اصول تھا۔ لیکن اگر اپنے علاقے میں لڑائی پہنچ جائے تو مجبوری ہے۔

ب : ہوشیار اور مضبوط دشمن پر ہاتھ ڈالنا بے وقوفی کی دلیل ہے۔ بات بھی درست ہے مضبوط اور ہوشیار دشمن پر ہاتھ ڈالنا دیوار سے سرنگرنے کے مترادف ہے۔ اس اصول کے درپردہ ناگہانیت یعنی (SURPRISE) پر زور دیا گیا ہے۔ دشمن بے شک مضبوط بھی ہو۔ اگر وہ چوٹنا نہیں ہے تو اس پر ہاتھ ڈالنے

میں کوئی مفاہتہ نہیں۔ ناگہانیت ۱ (SURPRISE) تو ہر ایک قوم کا ماننا ہوا جنگی اصول ہے۔ اس اصول کے اطلاق میں اہم بات تو یہ ہے کہ کسی اور قبیلے کے علاقے میں آپ چونکے نہیں ہوتے۔ آپ کو فکر تو صرف مری علاقے کی ہے۔ یہ ناگہانیت جگہ کی ہوگی۔ اس طرح وقت کا بھی تعین ہوتا ہے۔ روزانہ آپ ایک کام خاص وقت پر کرتے ہیں۔ جو کہ نہیں کرنا چاہیے مگر ہوتا ہے۔ جیسے گاڑیاں سڑک پر غفلت مہیا کرنے والے دستوں کو صبح، بجائی میں اور شام ہونے سے پہلے کیمپ میں واپس لاتی ہیں اب ہفتوں کوئی واردات نہیں ہوگی۔ لوگ احتیاط سے غافل اور اسی دن واردات۔ جگہ اور وقت کی وضاحت ہوگئی۔ اب ناگہانیت کا اطلاق طریقے کے بارے میں ملاحظہ کیجیے۔ ہر واردات کا طریقہ جدا اور انداز زللا۔ سابقہ طریقہ کو بہت کم ہی دہرایا جاتا ہے۔

ج : کارروائی پوری تیاری سے کی جائے۔ اس وقت تک دشمن پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔ جب تک سو فیصدی کامیابی کا یقین نہ ہو۔ یہ ان کا سب سے بڑا اصول ہے۔ بات بڑی سبب سے اسی لیے یہ بہت صابر بھی ہیں۔ دنوں بلکہ ہفتوں ممکنات میں بیٹھے انتظار کرتے ہیں۔ اس وقت تک شکار پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا جب تک کامیابی کا کامل یقین نہ ہو۔ آپس کے لڑائی جھگڑوں میں بھی یہ اصول ہمیشہ مدنظر رہتا ہے۔ ایک مری دوست اپنے ایک حریف کا قہر سنانے لگے۔ اسے ختم کرنے کے لیے انہیں سال بھر تک کوشش کرنی پڑی۔ کبھی حریف زیادہ نفری کے ساتھ نظر آیا۔ کبھی وقت کی غفلت ہوگئی۔ کبھی حالات سازگار نہیں آخریں ایسا بھنسا کہ دنیا بھر ان رہ گئی۔ مری حالہ کے باوجود مہینوں پتہ نہ چلا کہ واردات کس نے کی تھی۔

۵ : کارروائی تیزی سے ہونی چاہیے اور جائے واردات سے جلدی غائب ہونا ضروری ہے کہ جب بھی یہ اپنے ہدف پر فائر کھولتے ہیں تو سارے اٹھنا والی VOLLEY کی شکل میں۔ فائر بہت ہی تند اور تیز ہوتا ہے۔ گولیاں جائے واردات سے تھوڑی دور گھوڑے ہوتے ہیں۔ فائر کی تیزی آہستہ آہستہ مدہم ہوتی جاتی ہے۔ پھر اپنے گھوڑوں پر سوار اور غائب اب ہر ایک کے پاس تو گھوڑے ہوتے نہیں۔ اگر لوگ پیدل ہوئے تو کارروائی کی اور تیزی سے کھسکنے کی کوشش کی۔ علاقہ دشوار گزار

چننا جاتا ہے تاکہ آسانی سے پھیپھڑے کیا جاسکے۔ اگر پھیپھڑے کرنے والوں نے پکڑ لی یا تو ہتھیار چھپانے کے بعد قراری بن گئے۔

۳: اونچائی کو کسی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیے چونکہ علاقہ زیادہ پہاڑی ہے اس لیے یہ لوگ چھپ کر نہیں بیٹھتے۔ ورنہ ان آدمیوں کا نظر آنا ناممکن ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو چھپانے ہیں کہ آپ نے ان کے سر پر بھی پہنچ جائیں تب بھی ان کا پتہ چلانا مشکل ہے ان کے پاس دور بین اور رائفل کا ہونا ضروری ہے۔ یہ لوگ علاقے میں دیکھ بھال رکھتے ہیں۔ اسی طرح علاقے پر نظر رکھنا ضروری امر ہے۔ اب ہر ایک سے ہی توقعات استوار نہیں ہوتے پاس پڑوس

والوں سے ویسے بھی جھگڑے لگے رہتے ہیں۔ اب کسی اجنبی کو آتے دیکھا تو باقی آدمیوں کو شیشہ مار کر پکڑی ہلا کر یا دھواں پیدا کر کے ہوشیار کر دیا۔ انہوں نے اپنی مقررہ جگہیں سنبھال لیں اور سب جنگ کے لیے تیار۔ یہ تو دفاعی پہلو ہوا۔ اس طرح دیکھ بھال قائم رکھ کر جارحانہ کارروائی بھی کی جاتی ہے۔ اپنے حریف کی نقل و حرکت کو نظر میں رکھا۔ جب موقع دیکھا۔ منصوبہ بنایا اور بول دیا دھاوا یہاں کے ماحول در طرفتہ کو دیکھتے ہوئے اس طرح 'دید بان' کا رواج۔ عید ضروری ہے۔ ہر ایک کے پاس اپنی بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں۔ ان کی حفاظت بھی لازمی ہے۔ بھر چراگاہوں پر اکثر جھگڑے رہتے ہیں۔ بھیڑ بکریاں چراگاہ میں چھوڑیں اور اونچی جگہ پر دور بین لے کر بیٹھ گئے نظر مال اور اپنے بیوی بچوں پر پھر آئے کون آتا ہے چاہے امن ہو یا جنگ جہاں پر بھی یہ لوگ ہوں گے اونچائی پر دید بان کا ہونا ضروری ہے اور باقاعدہ مورچہ بننا ہوگا۔ مشکیزہ، روٹی اور رائفل سے لیس یہ رواج تو ہمیشہ قائم ہے اور رہے گا۔ جنگ کے علاوہ اپنی حفاظت بھی ضروری ہے۔

۴: مناسب کارروائی عمل میں لانے کے لیے صحیح خبر کا مہیا کرنا ضروری ہے۔ خبر فراہم کرنے کے طریقوں کا تو کوئی جگہ ذکر ہو چکا ہے۔ مگر یہاں ذرا تھوڑی سی وضاحت ہو جائے۔ ایک طریقہ تو 'حال' کا رواج ہے جو آپ پڑھ چکے ہیں۔ ہر ایک دید بان کے پاس شیشہ، پکڑی، لائٹ اور دور بین کا ہونا



ضروری ہے۔ اگر دھوپ ہو تو شیشہ ہلا کر مختلف اشارے کیے جاتے ہیں۔ اس شیشے کی چمک میلوں سے نظر آتی ہے اگر فاصلہ زیادہ نہ ہو اور دھوپ بھی کم ہو تو کپڑی کو مختلف انداز میں ہلا کر پیغام دیا جاتا ہے جہاں یہ دونوں چیزیں کام نہ کر سکیں مثلاً بیچ میں کوئی بیماری سلسلہ آجائے تو لائٹ سے آگ جلائی اور مختلف انداز میں دھواں پیدا کر دیا جو میلوں سے نظر آتا ہے۔ یہاں کا کالائٹ بھی خوب چیز ہے۔ پٹرول گیس کی کوئی ضرورت نہیں اور پھر سب سے بڑی بات ہر ایک فنی خوابوں سے مبرا انگشتی میں دو پتھر ہوتے ہیں اور ایک لوہے کا کڑا جسے چمکاک بھی کہتے ہیں پتھر کو لوہے پر رکھا چنگاری پیدا ہوتی۔ چنگاری کے قہر بہ پیش کا گورا ہوتا ہے جو فوراً آگ کھڑا ہوتا ہے پیش جسے اکثر "مزری" بھی کہا جاتا ہے ایک قسم کا پام کا درخت ہوتا ہے۔ جس کی چٹائیاں بنی جاتی ہیں پیش کا ذکر وضاحت سے کہیں اور کریں گے یہاں یہ ذکر کافی ہے کہ اس کے پتوں سے میٹھ بہا چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ آج کل غیر ملیکیوں میں اس کی رنگین چٹائیاں بڑی مقبول ہیں۔ یہاں تو بیڑا خوب ہوتا ہے مگر کون اس سے فائدہ اٹھائے۔

ن : حریف کے خلاف اگر کارروائی کی جائے تو قبیلوں کو مل کر مدد کرنی چاہیے۔ اس اصول کا گہرا تعلق رواج سے ہے اگر ایک قبیلہ کارروائی کرے تو جذبہ ناشدہ فوراً ہو جاتی ہے اور پھر خون بہا دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر نہ دیا گیا تو پھر قبائلی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک کے بدلے ایک اور دس کے بدلے دس اگر حریف طاقتور ہو پھر ریٹ بھی بڑھ جاتا ہے یعنی ایک کے بدلے دو یا تین بھی ہو سکتے ہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے مری علاقے کا انتظام چلانے کے لیے ایک کونسل آف ایڈرس (CON

CIL OF ELDERS) یعنی بزرگوں کی مجلس بنائی گئی تھی اس مجلس کے نورکن تھے اور سارے اپنے قبیلوں کے بڑے۔ ان کے سربراہ دو دواخان جو کہ موروثی عہدہ رکھتے تھے مقرر کیے گئے۔ جب ۱۹۶۴ء میں تین اور اراکین سمیت یہ کہان سے سستی جا رہے تھے تو راسے میں ٹھٹ لگا کر قتل کر دیے گئے۔ اس واقعہ کا حوالہ ہم نے پہلے بھی دیا ہے۔ اس کا رد وائی میں ایک ہی قبیلے کے لوگ نہیں تھے بلکہ یہ مشترکہ کارروائی تھی۔ بلوچی حال کے تحت سب کو معلوم ہے کہ کون کون اس میں شامل تھا اس کے بعد قبیلوں کی آپس میں لڑائی نہیں

ہوئی اور نہ ہی خون بہا کا سوال۔ یہ ہی حال دور حاضر میں ہوا۔ جو جزوی قبیلے تخریبی کارروائیوں سے بے گھر بھی رہتا چاہتے تھے وہ ایسا نہ کر سکے۔ قبائلی رواج کے تحت سب کا شامل ہونا ضروری اگر کسی نے انکا کیا تو خیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے چارونا چار "قراری" اور "فراری" برابر کے شریک جان ہو کر نہیں بلکہ رواج کے تحت اس طرح مشترکہ کارروائی سے مالِ قیمت کی تقسیم پر بھی آسانی ہوتی ہے اگر خدا نخواستہ کوئی کارروائی کرنے والا پکڑا بھی جائے تو باقی ماندہ مال کا ملنا مشکل۔ جب حالات خراب تھے تو بارگھان کے علاقے سے تخریب کار ڈیڑھ سو بھڑیں لے گئے۔ آخر ان لوگوں نے بھی تو رہنا تھا۔ کھانے پینے کا بندوبست بھی ضروری تھا۔ بارگھان میں کبتران رہتے ہیں اور یہ مال بھی انہیں کا تھا۔ بھڑیں لے جانے والے میں سے ایک جزوی قبیلے کا سراغ ملا یعنی وہ "زنگ" تھے۔ مال کبتران کے ایک وڈیرے کا تھا۔ انڈا وڈیرے نے زنگ کے وڈیرے سے ہاتھی زنگوں نے کہا ہے "تھے میں تو میں جس بھڑیں آئی ہیں تو تم دہلے جاسکتے ہو۔" ٹھٹھائیوں اور منڈائیوں سے دھول کرو۔ ان سے "بے کیے" قلم ہو۔ وہ تو آج یہاں کل وہاں۔ اگر زیادہ عرصہ گزر جائے تو چوری کا مال برون اپنے پاس رکھ لے۔ بیچ کر صاف کبڈ باقی مال نہیں مل سکے۔ یہی حال تخریبی کارروائیوں کا ہوتا رہا ہے۔

یہ تو ہو گئے اصول اب ذرا تلخیر پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست بہت ہی عزیز دوست ہیں پہلے وہ زمانے کے ملنے ہوئے فری تھے۔ یہ لوگ دوست بننے میں بڑی احتیاط کرتے ہیں اور پھر کسی سے دوستی کرتے ہیں تو بچاتے ہیں۔ ایک دفعہ دوست ہو گئی تو پھر کوئی پردہ نہیں رہتا ہم نے ان سے استدلال کیا کہ کتابیں آپ لوگوں کے متعلق بہت پڑھی ہیں۔۔۔ اور پھر مقابلے بھی اکثر ہوتے ہیں۔ ہم ٹھہرے پیشہ ور سپاہی کچھ تجسس سا ہے۔ ذرا زمین پر ہمیں بتائیں کہ آپ گھات کیسے لگاتے ہیں مسکرائے کہ جازیں ان قصوں کو۔ یہ باتیں تو آئی گئی ہو گئیں۔ اب ذکر کریں ترقی کے منصوبوں پر۔ یہ کام تو ہو رہے ہیں۔ ہم سے جو کچھ بن پڑتا ہے کر رہے ہیں سگریٹ کا ایک کش لگایا اور سوچ کر بولے۔ آپ نے جو کتابوں میں پڑھا ہے ٹھیک ہے مگر اب ذرا سافرق ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں کے تربیت کے کیمپ ۱۹۶۲ء میں لگے تھے۔ باہر سے بھی کھانے والے آئے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں کون تھے ایک سے تو ہم نے بھی تربیت لی ہے اب ذرا ہمارے کان کھڑے ہوئے

کان کھڑے ہونے والی بات بھی تھی۔ کیونکہ یہ افواہیں ہم نے پہلے بھی سنی تھیں کہ جناب کیمپ لگے اور تربیت ہوئی۔ سب سے پہلے کیمپ تدریجی پر لگا جو کہ ہونڈ سے بالکل قریب ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں سے انگریز تیل نکالتا تھا۔ جب یہ کیمپ کھلا اس زمانے میں یہاں آنا جانا آسان نہ تھا۔ صرف پیدل یا گھوڑوں ہی پر آمد و رفت ہو سکتی تھی اس کارروائی میں آپ اسٹارٹ قسم کے وڈیرے پیش پیش تھے۔ روایتی لوگ بھلا کب اس کو پسند کرتے۔ طاقت کا توازن ذرا بگڑنا نظریا طاقت کے توازن کی بات بین الاقوامی سطح پر ہی نہیں ہوتی بلکہ بین القباہی معاملوں میں یہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس قسم کی سوسائٹی میں سامان آیا مشیر آئے اور تربیت شروع ہوئی۔ یہ حالات دیکھ کر کچھ روایتی وڈیروں نے سازش کی اور سامان میں آگ لگوا دی۔ زبردست دھماکے ہوئے دھماکے شہروں ہی میں نہیں بلکہ یہاں بھی ہوئے تھے۔ ویسے یہ شہروں میں ہونے سے پہلے ہوئے تھے بات بڑھی اور پھر آپس میں عن طعن جن پر شک ہوا قتل کی سازشیں اور کچھ کیفر کردار تک پہنچا یا بھی گیا یجہتی بگڑتی نظر آتی تو آپس میں صلح مفائی کی کوشش بھی کی گئی مگر تھوڑا بہت رخنہ پڑا۔ کیمپ کو سونڈ تھل کے بہاؤ پر منتقل کر دیا گیا۔ آپس میں لڑائی جھگڑے کہاں نہیں ہونے لگے قبائلی روایات کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے یہ باتیں جلد ہی رفع دفع ہو جاتی ہیں بشرطیکہ انہیں ہوانہ دی جائے۔

اب ذرا ذکر مشیر یا انسٹرکٹر کا ہو جائے 'ان میں سے ایک جو پیش پیش تھے۔ مغربی بڑا دے پستہ قد گٹھا ہوا کسرتی بدن، منہ پر ہلکے ہلکے چھپکے داغ کہنے والے کہتے ہیں کہ گرمیوں میں ہمیشہ ننگ دھڑنگ رہتے تھے۔ صرف نیکر کے قسم کی ایک چیز زیب تن ہوتی تھی۔ ایلے ایک بھگی میں رہتے تھے دارھی بڑھی ہوئی۔ انہیں سنائی کا کوئی خاص خیال نہ تھا۔ مغربی انداز پر تربیت شروع کی کہ کس طرح بغیر رُسد کے گزارا کیا جاسکتا ہے۔ یعنی کبھی سانپ بچر ڈالائے اسے کمانے کا نسخہ بیان کیا۔ کبھی گیدڑ پکڑ کر پیٹ کی آگ بجھانے کی ترکیبیں بتائیں۔ یہ باتیں مسلمانوں کو یک پسند آتی تھیں۔ آپ اسٹارٹ قسم کے وڈیرے ان کے ساتھ ہوتے جو کہ ان کی زبان سمجھتے۔ کام ختم ہونے کے بعد دونوں بھگی میں اور شراب کا دور لوگوں کو یہ بت پسند نہ آئی۔ یہ کیا وایات حرکت ہے جہاں کھاؤ اور حرام ہو۔ معاملہ بگڑنا دیکھ کر



اس کو چھوڑا اور شروع ہوا۔ تدبیروں کا رکھنا۔

جانے دیجیے ان باتوں کو ہم تو سیدھے سادے پاکستانی ہیں ہمارا ایمان اور جان ہی پاکستان ہے اپنے اندر جب کمزوری ہو تو باہر والے فائدہ اٹھاتے ہی ہیں۔ جیسی دوستی اب ہے۔ اگر پہلے ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔ جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ کا خیال ضروری ہے آپ ہی ایک پاکستان کے ٹھیکیدار کہاں سے آگئے سب ہی محبت وطن ہیں۔ کس کو اپنے وطن سے پیار نہیں ہوتا۔ ہوتا تو ہے مگر اپنے اپنے نظریے کا تجزیہ صحیح حالات دیکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ لیجئے ہم علیحدہ ہو گئے جو ہم نے دیکھا 'اپنی آنکھ سے پڑھا اور کانوں سے سنا بیان کر دیا اور کرتے جا رہے ہیں۔ آپ کی مرضی جو آپ نتیجہ اخذ کریں۔ لیکن خدا پاکستان کی سلامتی اور فلاح کو سامنے رکھیے۔ آپ کو ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کا واسطہ۔ ایک مدد تو سہہ چکے ہیں اب دوسرے کی سکت نہیں۔' میں 'کو ذرا ایک طرف گردیں بے شک تھوڑی دیر کے لیے اس سے اچھی کیا بات ہے۔ اگر میں 'کی جگہ پاکستان لے لے۔

ذکر تدبیروں کا ہو رہا تھا اور ہمارے مری دوست کا۔ ہم انہیں منبری لے گئے یہ جگہ دکی سے تقریباً تیس میل پر واقع ہے۔ بورا لائی کوھلوک سڑک ادھر ہی سے گزرتی ہے۔ منبری ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں پر آبادی تمام 'لوئی' پٹھانوں کی ہے اور یہ انہیں کا علاقہ ہے مری علاقے کی حد دیہاں کافی دور ہیں مگر جہاں بھی چراگاہ ہو۔ انہوں نے تو اپنا مال چراگاہ ہے۔ پھر پڑوسی قبائل اسی میں اپنی غیر سمجھتے ہیں کہ ان سے تعلقات خوشگوار رہیں۔ اس خیر اندیشی میں ڈر کے ساتھ ساتھ معاشی حالات کو بھی دخل ہے۔ مری اپنا مال اور اون انہی لوئیوں کو فروخت کرتے ہیں اور پھر اس کے بدلے ضروریات زندگی بھی انہی سے حاصل کرتے ہیں۔ 'لوئی' پٹھان کافی کھاتے پیتے لوگ ہیں زمینیں ہیں باغات ہیں بس اور ترک بھی چلتے ہیں۔ جب پیسہ ہو تو لازمی کچھ جہتی میں بھی فرق پڑتا ہے۔ ویسے ان کے اپنے سردار بھی ہیں مگر سردار برائے نام۔ تعلیم والی بات ہوئی نا۔ ہر ایک معاشی تنگ و در میں معروف۔ پھر ہے بھی SETTLED AREA یعنی یہاں پولیس اور حکومت کا بھی دخل ہے۔ آپس میں لڑائیاں ہوں یہی مقتدر درجہ کر لیا اور تفتیش شروع۔ پھر سردار بات کو نمانا ہے۔ اگر مری قبیلے سے جھگڑا ہو تو کون سنتا



ہے۔ حکومت اور پولیس بھی مجبور۔ ابھی تو نہیں لیکن آج کل کے حالات سے پہلے ضرورت تھی۔ خود لڑنا ذرا مشکل۔ گھر بار چھوڑ کر کون پہاڑوں میں ان کا بیچھا کرے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ جیسے جی مری قبائل کے ساتھ صلح و آشتی قائم ہے۔ تو وہ رہتی ہے۔ ویسے لونیوں، زرقونوں اور اس پاس کے قبائل کو کافی گلہ ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ان کی زمینیں اور چراگاہیں ان سے جاتی رہیں۔ ٹائلٹ کے علاقے کا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے۔ خود تو کچھ کرنا مشکل اور حکومت ابھی تک بے بس۔ لڑائیاں بھی ہوئیں مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

منزلی سے کوئی تین چار میل پہلے سڑک کے کنارے پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ علاقہ فوسفیر آباد ہے ہم نے اپنے دوست سے کہا کہ اب بتائیں کہ یہاں پر کھچلی گرمیوں میں جو آپ لوگوں نے ہماری گاڑیوں پر گھات لگائی تھی۔ اس کی کارروائی کس طرح کی گئی تھی۔ اس حادثے میں ہمارے بچہ جوان شہید ہوئے اور اتنے ہی زخمی آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ ایسے حادثے کے بعد دوستی کا یہ عالم تو جناب بھائی کو کر بھائی سمجھتے ہوئے ساتھ ملنا ہے تو اس کی خامیوں کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اور جائز تکلیفوں کا بھی تذکرہ لازمی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات آپ میں بھی تو خامیاں ہوں گی۔ ان کو بھی ٹھوڑیے۔ دوستی کے سلسلے میں قربانیاں دینے کے لئے بھی تیار رہیے۔ لڑائی اور جبر سے تو دشت اور غارتگری جنم لیتی ہے۔ محبت سے قربت قائم ہوتی ہے اور اخوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ راستہ دشوار گزار ضرور ہے مگر نیک نیتی سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا محبت ہی سے لوگ خدا کو بھی پالیتے ہیں۔ محبت ہی معراج ہے۔ پھر فلسفے میں بھنس گئے۔ قصہ سناؤ اور بت ختم کرو۔ دل کو لگی ہوئی بات کیسے مختصر ہو سکتی ہے۔

اس پہلے کہ ہم اپنے دوست کی رو بہ ادب بیان کریں آپ ہماری بھی سن لیں۔ جب دن خراب تھے تو ہماری گاڑی بھٹے میں مدد لورالائی سے کوصلو آتی تھیں۔ گاڑیاں کانولے کی صورت میں ہوتی تھیں کہنوا سے مراد یہ کہ گاڑیاں اکٹھی سفر کرتی تھیں۔ ان پر ریشن ہوتا تھا۔ فوجی اور اکثر اوقات عام آدمی بھی سفر کرتے تھے۔ گاڑیوں کے آگے اور پیچھے محافظ دستے کا ہونا لازمی تھا۔ دستے میں تعداد تیس چالیس ہوتی ہوگی۔ اب اگر کانولے میں تیس گاڑیاں ہوں تو یہ ایک میل سے زیادہ فاصلے تک پھیل جاتی تھیں اور

سے کو حلو تک کا سفر تقریباً ایک سو میل سے زیادہ بنتا ہے۔ اگر پورا راستہ مکمل طور پر محفوظ کرنا ہو تو جناب پھیلے آدمیوں کو سو میل سے اوپر تک کتنی فوج لگے گی۔ اب مری علاقے میں یا اس تک پہنچنے کے لیے یہی ایک سڑک تو نہ تھی بلکہ ماشا اللہ کافی سڑکیں بن چکی ہیں۔ ان دنوں یہ ہی کیا جاسکتا تھا کہ صرف اہم مقامات پر دستے تعینات کیے جائیں اور چوکیاں قائم ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس علاقے میں یہ خیال و گمان ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں مادہ درپیش آسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ علاقہ بھی مریوں کا نہیں SETTLED AREA ہے۔ اس کی ذمہ داری یہاں کے سردار اور ریوی کی ہے۔ جن کے تعلقات پہلے ہی مری قبائل سے کوئی استوار نہیں۔ بہر حال پھر بھی احتیاط کی گئی۔ حفاظتی دستہ ساتھ تھا۔ چوکیاں بھی نہیں مگر دور۔ نفی دیکھتے ہوئے یہی کچھ کیا جاسکتا تھا۔

ہمارے دورت جاتے واردات کو دیکھ کر سکرائے اور کہنے لگے۔ ”مغرب کی جانب سے آپ سہاؤ کا پہاڑ دیکھتے ہیں۔ یہ پیار جے واردات سے پندرہ میل دور ہے لیکن اگر موسم صاف ہو اور دور بین اچھی ہو تو اس سڑک پر حرکت سہاؤ سے نغراتی ہے۔ ہم نے وہاں چڑھ کر خود آزما یا ہے۔ ہم لوگ اس علاقے کے رہنے والے ہیں۔ مال چرائی اس علاقے میں بھی کرتے ہیں۔ چرائی کے لئے ہم کٹ منڈائی جو کہ سب کے پاس ہے وہاں سے شروع ہو کر کے سہاؤ سے ہوتے ہوئے شمال تک جاسکتے ہیں“ انہوں نے ایسے بیان کیا کہ جیسے یہ سارا فاصلہ کوئی منی نہیں رکھتا۔ تقریباً دو سو میل کا سفر ہو گا۔ بات سہو اور شمال تک کی تھی شمال تک منہری سے مشرق کی جانب تقریباً تیس میل پر بڑی چراگاہ ہے۔ ہمارے آدمی کافی عرصہ تک ان گاریوں کی حرکت کو دیکھتے رہے پہلے اس حرکت کا جائزہ سہاؤ سے کیا گیا۔ پھر قریب آکر ہمارے دیدبان بیٹھے ان لوگوں پر آپ کو شک کیسے ہوتا۔ ان کے ساتھ بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں اور نظر بھی نہتے آتے تھے۔ ہمیں پتہ لگا کہ لگے اور سب سے پیچھے والی گاڑی پر گارڈ ہوتی ہے اور باقی گاریوں پر سامان اور کچھ آدمی جو سفر کر رہے ہوتے ہیں اب آپ مشرق کی جانب نظر دالیں تو تمام پہاڑ ہیں اور یہ سلسلہ کافی دور تک چلا جاتا ہے اور مغرب کی جانب میدان۔ آخر میں یہ طے پایا کہ یہ جگہ گھات کے لیے موزوں ہوگی۔ ہم سہاؤ سے چلے اور یہاں سے پانچ میل مشرق کی طرف پہاڑیوں پر قیام کیا۔ ہم تب بھی ایسی واردات کرتے ہیں تو یہ ایک کھیلا

قبیلہ نہیں کرنا۔ ہمارے ساتھ تیس اور جزوی قبائل کے آدمی تھے۔ تیس ہمارے اپنے اور بیس بیس دوسرے قبیلوں کے۔ چلنے سے پہلے ہم وڈیروں نے اپنی کانفرنس کی کس طرح کام کرنا ہے پھر اپنے کمانڈر مقرر کیے ہم اپنی کمین گاہ میں تین دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ اپنے دیدبان اسی دن سے پاس کی پہاڑیوں میں بٹھائے تاکہ گازیوں کی حرکت کو غور سے دیکھا جاسکے پھر ہم تینوں کمانڈروں نے متفقہ طور پر یہ جگہ کارروائی کے لئے چنی۔ اب آپ اگر مشرق کی طرف دیکھیں۔ تو ان پہاڑیوں کے تین سلسلے ہیں۔ ایک تو بالکل سڑک کے ساتھ ساتھ ہے اس پر ہم نے اپنی پہلی ٹولی تعینات کی کہ وہ قریب سے فار کھولے اور اگر کوئی ہتھیار چھین سکنے ہیں یا کوئی لوٹ کالہ ہاتھ آئے تو جلدی سے اٹھا سکیں۔ دوسرا پہاڑیوں کا سلسلہ بالکل قریب ہے اور نسبتاً اونچا ہے دوسری ٹولی اس پر بٹھائی۔ ان کا کام اگلی والی ٹولی کو فار سے مدد دینا تھا یعنی جب اگلی والی ٹولی لوٹ مار کرے تو پیچھے دالے باقی اور دستوں پر فار جاری رکھیں تاکہ ان کی کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو پھر آپ دیکھ رہے ہیں کہ تیسرا پہاڑیوں کا سلسلہ بہت ہی اونچا اور قدرے دور بھی سیلا ہے پر ہماری تیسری ٹولی تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ جب آگے والی ٹولیاں کام ختم کر چکیں تو ان کی پیش قدمی کے لئے مدد دیں۔ یہ آخری ٹولی سب سے آخر میں اپنی جگہ چھوڑتی ہے۔ تاکہ آپ لوگ پیچھا نہ کر سکیں۔

"جب ہم نے علاقہ چن لیا اور اپنی تجویز منالی تو پھر دو رات پہلے آکر ہم نے پہاڑوں پر مورچے بنائے یہ چھوٹے مورچے اس طرح بنائے جلتے ہیں کہ ظاہر نہ ہو کہ پہاڑیوں میں کوئی رد و بدل کی گئی ہے۔ مورچوں کے سامنے سوراخ چھوڑ دیئے جلتے ہیں تاکہ رائفل کا استعمال آسانی کیا جاسکے مورچے بنانے سے پہلے ہی دیدبان کی جگہ مقرر کی جاتی ہے۔ یہ دیدبان جائے واردات کے دونوں جانب ہوتے ہیں اور میلوں تک علاقہ دیکھ سکتے ہیں۔"

ہمارے دوست نے اشارہ کرتے ہوئے دیدبان کی جگہ بتائی وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ میلوں سے کسی بھی قسم کی حرکت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے اگر دوڑیں پاس ہو۔ پھر میلوں کی سڑکوں پر جب گاڑیاں چلتی ہیں تو گرد کے بادل دور سے اٹھتے نظر آتے ہیں۔

"ہم نے یہ طے کیا کہ آپ کی آگے والی گاڑیوں کو ہدف بنایا جائے گا تاکہ آپ کے حفاظت دتے مناسب۔"



کارروائی نہ کر سکیں۔ جب حفاظتی دستے گاڑیوں سے اترنے کی کوشش کریں تو پر بھی فائر کھولا جائے۔ جب پہلی دفعہ فائر کھولا جاتا ہے تو پہلے میں منٹ تک انتظار فرما رہے ہوتے ہیں یہ وقت ہمارے لئے بہت کافی ہوتا ہے کہ ہم اپنا کام کر کے علاقے سے نکل سکیں دوسرے دن ہم نچلے مورچے سمجھا لے۔ یہ کام ہم اندھیرے میں ہی کرتے ہیں تاکہ اندھیرے میں تیاری کر کے ہم دن میں پھپھے بیٹھے رہیں۔ یہ دن ہمارا ضائع نہیں کیا کیونکہ اس دن کوئی گاڑی نہ آئی تیسرے دن دس بجے ہمارے درمیان نے شیشے سے اشارہ کر کے بتایا کہ تقریباً بیس گاڑیاں آ رہی ہیں ہم لوگ تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ جب ہدف سامنے آیا تو ہم نے پار گاڑیاں گزرنے دیں۔ اگلی گاڑی میں ملیشیا کے جوان تھے بیچ والی گاڑیوں میں سامان ان گاڑیوں میں بھی کچھ جوان تھے۔ پہلے ہماری اگلی والی ٹولی کے کاڈز نے دو گولیاں چلائیں۔ یہ اکٹھا فائر کھولنے کا اشارہ ہوتا ہے اس طرح دو تین منٹ تک تند و تیز فائر جاری رہا۔ پھر اگلی والی ٹولی نے پتہ کام دکھایا۔ اس دن جب فائر کھلا تو آپ کی گاڑیوں میں تیل کے ڈم تھے اس طرح دو گاڑیوں میں آگ لگ گئی۔ باقی آدمیوں نے اترنے کی کوشش کی تو وہ بھی ہمارے فائر کی زد میں آئے۔ اس گھات میں ایک غامی تھی۔ وہ یہ کہ سڑک کا مغربی علاقہ میدان ہے۔ پچھلی والی گاڑیاں ادھر چپ کر نکل گئیں۔ ہمارے آدمیوں نے بھی آپ کے فائر کا جواب دیا ہو گا۔ جواب تو دیا مگر ہمارے مورچوں پر کیا اثر ہو سکتا ہے اور پھر ہم اونچائی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ جب تک آپ کے آدمی گاڑیوں سے اتریں اور ہم بیچ واد کریں ہمارا کام ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ نقصان ہمارا بھی ہوتا ہے مگر اتنا نہیں دراصل آپ لوگ اس طرح ڈرائی کے لئے تیار نہیں ہوتے اور گاڑیوں میں بیٹھے ہوتے ہیں وہ بھی چلتی ہوئی گاڑیاں مگر ہم لوگ تو ہر طرح تیار ہوتے ہیں اور آپ کا انتظار ہوتا ہے۔ جب اچانک وار ہو جائے تو سنبھلتے سنبھلتے بھی دیڑھ گنتی ہے۔ آپ کے آدمیوں نے ہمارے چھا کرنے کی کوشش کی۔ ہماری پہلی دو ٹولیاں تو آرام سے نکل گئیں۔ کیونکہ تیسری اور اونچی والی پہاڑی کی ٹولی فائر کرتی رہی اور آپ کے آدمیوں کو اس نے ان کے قریب آنے سے باز رکھا۔ اب آخری ٹولی ہم پہنچا کرنے والوں کو پہنچنے پہنچنے کافی دیر لگی کیونکہ فائر کے دوران اونچائی چڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ آپ خود دیکھیں کہ اگر ایک آدمی بھی اس اونچائی پر بیٹھا ہو تو کیسے اوروں کو اوپر آنے دیکھا۔ آخری ٹولی کے لئے پیچھے گھوڑے بندھے ہوئے تھے وہ



گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے نکل گئے۔ واردات کے بعد تینوں ٹولیوں نے مختلف راہ اختیار کی اور دوسرے دن شملانگ میں اکٹھے ہوئے۔

”یار ایک بات بتاؤ جن لوگوں پر تم نے فائر کیا انہیں تم ذاتی طور پر جانتے تھے، ان سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“

”نہیں صاحب کیا کریں۔ بس جہالت“  
 ”بھائی ایسی کیا جہالت ہوئی کبھی تم نے سوچا کہ جس کو تم نے شہید کیا ان کے بھی بیوی بچے ہوں گے۔  
 آخر وہ بھی تو انسان تھے۔ وہ بھی پاکستان کے رہنے والے اور مسلمان تھے۔“

”کیا کہیں شاہ صاحب۔ ان باتوں کو مت یاد دلاؤ۔ آپ لوگ ہم سے بہتر مسلمان ہو۔ یہ بات نہ ہوتی تو ہم لوگ کیسے ابھی زندہ ہوتے۔ ہمارے اپنے بلوچی رواج کے تحت ہمیں گولی مار دینی چاہیے۔ گولی مارنا تو درکنار ہم آزاد پھر رہے ہیں بس جہالت۔ دعا کرو کہ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔“  
 آپ نے دیکھا ایک کارروائی کا نمونہ یہ واقعات کئی مرتبہ ہمارے گئے ہیں کبھی انجینئروں کے ساتھ سڑک یا پل بناتے وقت یہ حادثات پیش آئے تو کبھی نہتے بے بس اہلکاروں پر برسوں کی تیز اور وڈیرہ شاہی نے تو رنگ لانا تھا اور سب سے زیادہ ہماری اپنی پرانی بے راہ رفتہ۔ ٹرپڑی جیوڈز چھوڑ گیا اس کی غلامی۔ غلامی بھی ٹھیک سے نہ ہو سکی۔ زبان سے بھائی کہا مگر اسے نہ کیا۔





پہلوی کے دامن میں آگ لگ ان گھبروں میں رہتے ہیں



## حرکت

ہری قبائل کی کارروائی کرنے کا آپ کو چھ اندازہ تو ہو گیا ہو گا۔ ان مسئلہ جنتوں کی تھوڑی دھت اور کردی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ اپنی دشواریاں کسی حد تک میان کردی جائیں جب تک فن سپاہ گری قائم ہے۔ حرکت (MANOUBILITY) ایک ایسی فوجی اصطلاح ہے جو بہت عام ہے اور اکثر استعمال ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اب پتہ نہیں کہاں تک اردو میں "حریت" نہیں غور پر ہوتی ہے کہ کا ترجمہ نہ سکتا ہے بہر حال یہ ترجمہ میں نے فوجی لغت سے سیکھا ہے جس میں تین سی اصطلاحوں کے ترجمے دیئے ہوئے ہیں۔ "حریت" مطلبی کا ترجمہ دل کو نہ نہیں مل رہا ہے۔ روکی تو خوبی یہی ہے۔ ایک لفظ اگر رائے ہو گیا تو زبان میں گوجا نا ہے۔

حرکت سے مراد ہر حالت میں تیز رفتاری برقرار رکھنے سے ہے۔ اس اصطلاح کو عمومی مقابلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جنگ عظیم دوم کے دوران شمالی ذلیقہ کے لڑاؤ میں جرمن فوج کی حرکت انگریزی فوج سے سب سے زیادہ بہتر تھی۔ یعنی وہ جہاں اور جب چاہتے فوجی فوج کے مقابلے میں وقت اور فیصلے کے حساب سے پہلے پہنچ سکتے تھے۔ حرکت کا انحصار زیادہ تر فوجی ساز و سامان کی ساخت پر



بھی ہوتا ہے۔ جرمنوں کی گاڑیاں اور ٹینک بناوٹ کے لحاظ سے محرم میں تیزی سے چل سکتے تھے پھر ان کی فوج کی تنظیم بھی بہتر تھی۔ یہ تنظیم موقع اور محل کے لحاظ سے ترتیب دی گئی تھی۔ حرکت کا تعلق ہمیشہ گاڑیوں سے نہیں ہوتا۔ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جہاں سڑک موجود نہیں ہوتی۔ فوج کو تو بہر حال حرکت کرنی ہے بغیر حرکت کے لڑائی جیتی نہیں جاسکتی۔ حرکت کرتے وقت ساز و سامان ہتھیار ایمونیشن اور رسد بھی ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کتنا سامان آپ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں اور کوئی چار نہیں تو ان سب چیزوں کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر خود اٹھائیں تو کتنا سامان اٹھ سکتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ کتنی دور چل سکتے ہیں۔ یہاں تا ہے کہ آٹ کس یہ کام مشکل نہیں۔ بائبل کا پڑھنا آتا ہے۔ جہاں مرضی ہے جاسیں اور مع ساز و سامان کے جا کر اتر جائیں۔ اگر غریب ملک ہے تو کیا کرے۔ بیل کا بروئے خاص بنی چیز ہوتی ہے۔ بیل کا بڑی اپنی خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ چلنے مانے لیتے ہیں۔ لیکن عزت کا کیا کیا کیجئے۔ کام تو یہاں کرنا ہوتا ہے۔ فوج ہی کیا جہاں مشکلات سے ٹک ہائے۔

ذکر توبہ و حستان کا سورج ہے کسی جنگ کا نہیں۔ جنگ کی بات ہوتی تو اور باتوں کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ دروغ برگردن راوی۔ یہ شروعا شروعا کی بات ہے کسی جگہ تخریب نے گھات لگا کر کچھ نقصان دیا۔ یہ جگہ کوئٹہ سے کافی دور تھی دوستوں کو گھاسی گیا۔ منسوب بنایا کہ سپاہی علاقہ چھا اباٹے اور تخریب کاروں کو پکڑا جائے۔ گرمی کا زمانہ تھا اس علاقے میں پانی نایاب اور پھر دھچی دھچی پیارویوں کو دن میں مہور کرنا ذرا مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ پہاڑ سے گزر کر جب دوسرے پہاڑ پر پہنچے تو زبانیں باہر آئیں۔ پانی اب پانی کہاں جو پانی ساتھ تھا دریا میں ختم ہو گیا۔ بنیر پانی کے آگے نہ بڑھا۔ اور پانی علاقے میں ناپید۔ سب کو واپس بلا لیا گیا۔

اب آخر اس علاقے میں جہاں پانی میلوں تک ناپید۔ دشوار گزار جنگلیں اونچی اونچی کھڑی ہیں۔ آخر کوک رہتے تو ہیں پلٹے پھرتے بھی ہیں۔ پھر پانی پلٹے ہیں۔ جہاں تھوڑی بہت زمین مل گئی فعل بھی دکھائی دیتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات موقع مل گیا تو حریف سے دو دو بات بھی کر لیتے ہیں۔ یہ آج سے نہیں، صدیوں سے پڑا آ رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات ہمارے ہی ساتھ نہیں بلکہ انگریزوں کے ساتھ تو ایسے حادثات اکثر ہوئے ہیں۔

فوج "کہان" کے محاصرے کے لئے چلی چلتے چلتے پانی ختم ہو گیا۔ اب آگے جاتے ہیں تو کوئی پتہ نہیں پانی ملے گا بھی یا نہیں۔ پیچھے آتے ہیں تو فاسلہ بہت زیادہ آگے چلے تو بقول شیعے مری پڑ گئے۔ آدمی فوج ختم ہو گئی۔ چار دن اپار پیچھے آنے کی ٹھانی۔ واپس ہوئے تو راستہ کٹنا ہو پایا۔ مشکل سے کچھ لوگ بچ سکے۔ یہ ہمارے ایفرنگیوں ہی کے ساتھ نہیں اوروں کے ساتھ بھی ہوا ہے یعنی مغلوں اور ترکوں کے ساتھ بھی یا جو اور قومیں آتی رہیں بھائی یا اگر تارتخ میں ہوا ہے تو بار بار کیوں ہوا۔ لوگوں نے تارتخ نہیں پڑھی مگر ایک بات یاد رکھیں تارتخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ تارتخ سے کوئی سیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ چلے جائے وہ ان باتوں کو خود ٹھوکر کھا کر ہی آدمی سمجھتا ہے کہ رات کہ جب آپ روم جائیں تو ایسا ہی کیجئے جیسا روم کرتے ہیں۔ یعنی جیسا دس دیا بھیس جہاں تک مری قبائل کی حرکت کا تعلق ہے۔ سب سے اہم چیز ان کا نگہ تھا ہوتا ہے جسے پنجابی میں کھوتا کہتے ہیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ میدان جتنے ہیں جہاں رکھیں۔ مہموں جیب آرام سے جاسکتی ہے بس وہی حالت یہاں کے گدھے کی ان پہاڑوں میں ہے۔ اول تو ان دنگوں کی ضروریات زندگی بہت کم ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہیں پورے گھر کا سامان دو گدھوں پر آجاتا ہے۔ جہاں پڑاؤ کرنا منظور ہو گا گدھوں کو روکا جائیگا۔ جسے بک کر نصب کی اگر ضروری ہوئی تو دن کی چادروں کے خیمے بنائے جکی تائی۔ تاج بے آگ ہلا کر دوٹی پکائی۔ جسے کاک کہتے ہیں یعنی آٹا کو نہ گول پتھر پر پٹیا اور آگ میں ڈال دیا۔ اس روٹی کی تعریف یہ ہے کہ ہفتوں خرب نہیں ہوتی چائے سے سب شوقین ہیں۔ چائے کے ساتھ روٹی کھائی اور اللہ شہید ہو۔ بھیریں چونکہ سوتے ہوتی ہیں۔ انہیں کا روٹھ ممکن یا غیر مل ہی جاتا ہے۔ اگر کوئی جہان بیا تو فاضل لازمی ہے۔ جہاں نوازی کے بڑے پختہ روٹے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جہان میں دن سے زیادہ خود نہیں رہتا اگر اسے رہنا چاہی پڑے تو اپنا بندوبست کر لے یا دوسرے کی نیکی میں چلا جاتا ہے۔ جہان کے لئے سستی بنانا ضروری ہوتا ہے۔ سچی یہ سمجھ لیں کہ بھیر کے بچے کا روٹھ ویسے یہ روٹھے ہیں زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ بھیر کی کمال اتاری اس کی ٹانگیں او دھڑیل دھڑیل بلوٹھ کر لیا۔ ان اعضاء کو لکڑی لگا کر تھرا کر دیا چاروں طرف دھیمی دھیمی پنج جلا دی۔ جب پانی خشک ہو گیا تو بچی تیار۔ اگر زیادہ قیاش کی ضرورت ہو تو گوشت پر ہلکا ہلکا نمک لگا دیا۔ کیا بات ہے سچی کی۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ جتنا مرضی کھائیں پیٹ خراب نہیں ہوتا۔ ہاں جہان نوازی کے رواج کے تحت یہ

فزوری ہے کہ ہر سات آدمیوں کے لئے ایک دنبہ ہونا چاہیے۔ اگر حساب میں ایک آدمی بھی بڑھ جائے تو دوسرا دنبہ ذبح کرنا فزوری ہوتا ہے۔

جہاں یہ لوگ پڑاؤ کرتے ہیں وہاں پانی کا ہونا فزوری ہے اس کے بعد علاقے میں جانور چرائے۔ یہ پڑاؤ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک علاقے میں گھاس موجود ہے۔ پڑاؤ سے دس پندرہ میل دور گھومنا معمولی بات ہے جب بھی چیلنگی ٹھان تو منٹوں میں گھر کا سامان گدھوں پر لادا اور چلے جاتا ہے۔

دوسری اہم چیز ان کے گھوڑے ہیں جن کا حرکت سے براہ راست تعلق ہے گھوڑے تو ہر ایک کے پاس ہوتے نہیں۔ یہ تو امیر آدمی یعنی دڈیرہ ہی رکھ سکتا ہے اور ہر ایک دڈیرہ ٹووا اپنی استعداد کے مطابق گھوڑے تعداد میں زیادہ ہی رکھتا ہے۔ یہ ایک قرن ان کی عمارت کی علامت سمجھ لیں۔ پڑاؤ کے ارد گرد یعنی قس جالیس میل چھپا مارنا بو یا دوسرے قبیلے کے لئے گھات لگانا بو یا پولیشی ٹھانے بول تو گھوڑے اکٹھے بنائے واردات کا بخوبی جائزہ لیا منسوبہ شوک برآ کر بنایا گیا اور پھر آرام سے دو تین دن تک ہدف کو نگاہ میں رکھا منسوبے میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔ پھر واردات کے دن جائے وقوع سے دو تین میل بہت کر سب کچھ بونے گھوڑوں کو وہیں چھوڑ دیا۔ واردات کی۔ پھر گھوڑوں پر سوار اور حرکت قائم۔ پکڑے اب تو پکڑا جاتا ہے گھوڑے خبر سانی یا ایک جگہ سے دوسری جگہ ملپ رکھنے کے لئے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ ویسے گریجی ہو دشمن کی آمد کی خبر پورے علاقے میں دینی ہو تو اونچی جگہ پر آگ جلا کر دھواں پیدا کیا جاتا ہے۔ دھوئیں سے مختلف اشکائے بھی بنائے جاتے ہیں۔ یا پھر شیشہ مار کر شیشہ مارنا۔ ایک خاص شمارہ ہے اس کا ذکر کہیں اور کیا جائے گا یہاں اس سے مراد دھوپ میں شیشہ جلا کر خبریں فراہم کرنے سے ہے۔ اس شیشے کی چمک میلوں تک جاتی ہے۔ مختلف انداز میں اسے ہلا کر بت چیت بھی بنا سکتی ہے۔ جنگ شیم دوم سے پہلے یہ طریقہ فوج میں بھی رائج تھا جسے ”ہیلو“ کہا جاتا تھا۔

تیسری اہم چیز جو حرکت کو یہاں برقرار رکھتی ہے وہ ان لوگوں کا مشکیزہ ہے۔ مشکیزہ بھیر دیکری کی کھال کو سکھا کر بنایا جاتا ہے جس علاقے میں پانی کی قلت ہو بہرہ ذرا اس کو ساتھ رکھتا ہے۔ اس کا وزن نہ ہونے کے برابر اور پانی بھی ٹھنڈا۔ بس سمجھ لیں گرمیوں میں برف کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر دور دراز کا سفر ہے

اور موسم بھی گرم تو دن میں پانی ایک ہی دفعہ پیا جاتا ہے۔ چلتے چلتے اگر کثرت پیاس لگے تو بڑے سیتے اور اہتمام سے ہونٹوں کو ہلکا ہلکا گھیرا کر پیا جاتا ہے۔ سچ بات بھی یہ ہے کہ اگر گرمی میں سفر کے دوران پانی ایک دو گھنٹ زیادہ پی لیا جائے تو پیاس کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جتنا پانی پیں اتنی ہی آرام کی خواہش بہتر ہی ہے کہ کم پانی پینے کی عادت ڈالی جائے۔

فوج میں امن کے دوران حرکیت قائم رکھنے پر بڑا زور ہوتا ہے، اکثر مقابلے لکھے جاتے ہیں اور پتہ نہیں کتنے لکھے جا چکے ہیں۔ آئے دن مظاہرے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ کوئی نئی بات اکثر کم ہی ہوتی ہے مثلاً جہاں گاڑیاں نہ جاسکتی ہوں۔ وہاں خچر استعمال کئے جائیں۔ یہ تو پرانی بات ہے جب ہی تو ضرورت ہے کہ یاد دہانی کرنی پڑے۔ لوگ بھول بھی تو جاتے ہیں۔ خچر پر سامان لادنے اور اتارنے کی مشق ضرور دی ہے، ہر ایک خچر پر ایک سو بیس پائونڈ سے زیادہ وزن نہیں ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اب جب خچر کی بات شروع ہوئی گئی ہے تو ایک مسئلہ آپ بھی سن لیں اور اسے حل کرنے کی کوشش کریں، ایک دفعہ کورس کے دوران ہمارے ایک استاد خچر پر سامان لادنے اور اتارنے کا طریقہ بیان کر رہے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے استاد سے سوال کیا، جناب کبھی آپ یہ کہتے ہیں کہ خچر بھاگ جاتی ہے اور گرمی پھر دھلتی مارتا ہے۔ یہ بتائیں کہ خچر موٹا ہے یا مڈکڑا استاد کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے، کچھ بھنکاتے ہوئے بولے، ”معاذ یہ کھاس خچر پر سامان لادنے اور اتارنے کے بارے میں ہے۔ اس کا سبق نہیں چل رہا ہے۔ یہ سوال کسی مونڈی صاحب سے کیجئے گا“ ہم نے بہت سے لوگوں سے یہی پوچھا مگر مسئلہ ابھی تک اپنی جگہ قائم ہے۔ ہاں تو بات فوجی خچر کی ہو رہی تھی، اگرچہ یہ بھی پہاڑی علاقے میں حرکیت قائم رکھنے کے لیے خچر ہی استعمال کرتا تھا۔ فوجی خچرے ساتھ بڑی غلٹیں ہوتی تھیں، ایک تو اس کی خاص غذا کا ساتھ ہونا ضروری ہے پانی بھی ماشاء اللہ ڈنٹ کر پیتا ہے۔ اب اگر آپ چار خچر ساتھ لے جا رہے ہیں اور سفر چوبیس گھنٹے کا ہے تو دو خچر اپنی غذا اور پانی اٹھائیں گے باقی دو پر آپ اپنا سامان لے جاسکتے ہیں یہی حساب آپ وزن کے بارے میں لگاتے جائیں، ان کی دیکھ بھال کی مسیبت علیحدہ۔ اب مالش کا وقت ہے، پانی کی ضرورت ہے۔ اب اگر خچر بیمار ہو تو ڈاکٹر کو بھی دکھانا لازمی ہے پھر جہاں شام ہوگی تو جو یہ شہر پہنچتے ہیں کہ الامان الحفیظہ۔ ”خزخز، فرفر“ دور سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں فوج آئی ہوئی ہے ویسے



ان کی آواز بند بھی کی جاسکتی ہے۔ وہ صرف ان کا ڈاکٹری کرتا ہے اس کے لئے بھی وقت چاہیے بے زبان جاندار ہے کیوں ظلم کرتے ہو۔ مگر ایسا کیا جاتا ہے۔ ایسے پہاڑی علاقوں میں ہر جگہ ان کا جانا بھی مشکل پھر نیچلے پتھروں پر ان کے گھر ستیاناس ہو جاتے ہیں۔ حرکت مظاہرے اور مقابلوں تک تو قائم ہے جب میدان سامنے آیا تو سستی کم۔ ہاں انگریز انہیں فوراً استعمال کرتا تھا۔ مگر راستوں پر وہ دن میں پندرہ میل سے زیادہ نہیں چلتا تھا۔ پندرہ میل کے بعد پڑاؤ اور پھر آرام آرام سے کام ہوتا ہے۔ لیکن آج کل تو سراسر روزانہ ہے ہر ایک چیز کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ جنگ عظیم دوم کا واقعہ یاد آگیا آپ بھی سن لیں جب ہر مار دزدن کی کارروائی سے کام نہیں ہوتا۔ کام بنے کا پتہ سات دن باہر کر۔ مختلف اطراف سے بھیج کر نے سے یعنی بالکل قبائلیوں کی طرح کارروائی ضروری ہے۔

گاڑیوں اور خچروں کو اس حد پر خیر باد کہا جہاں تک ان کی پہنچتی۔ اب گاڑیوں اور خچروں کے تھکے میں گدھوں کی ڈوبوں کو دیکھئے۔ گدھا اور خونی۔ یہ سب عام طور پر لوگوں کو ہنسی آجاتی ہے مگر اس بات میں بیداریاں ہیں خاص طور پر ان راستوں میں۔ پتہ نہیں کہ رائے۔ مگر اس کے خدو کیوں ہے۔ رائے مگر کی یہ ہی رہی۔ مثل مشہور ہے کہ وقت پر گدھے دھبی باپ بننا پڑتا ہے۔ لے آئے اس کے مخالفین کی جہاں پر اب اس کے آگے کہن شائستگی کی حدود سے تجاوز ہوگا۔ ویسے مثل بیان کر کے شائستگی پہلے ہی کون سی جتن رو گئی ہے۔ خیر ذکر ہو رہا تھا گدھے کی خوبوں کا۔ پہلی بات تو یہ کہ جہاں تک وزن اٹھانے کا تعلق ہے۔ یہ خیر سہارا کل تم پتہ ہے۔ حاراند خچر سے جسامت میں سبب چھوٹا ہوتا ہے۔ پھر اسے کسی نام پر اسے کی بھی نہ دیتا نہیں۔ جب منزل ختم ہوا اسے صد چھوڑ دیں گے اس پھوک سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ پھر مزے کی بات ہے اسے دوا نہیں جانا۔ خچر یا گھوڑے کو چھوڑ کر دیکھیں۔ دوبارہ پکڑنا مشکل ہوگا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ اسے یہاں کے راستے معلوم ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ اسی علاقے کا ہو اس پر سامان لاد دیں اور آگے چل دیں۔ آرام سے آگے آگے چلتا ہے۔ اس پکڑ کر آگے آگے چلنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے گدھے کے لئے کوئی راس ہوتی بھی نہیں۔ اگر غلط راستے پر ہو جائے تو بانک کر سیدھے راستے پر ڈال دیں۔ جب اسے پیاس لگتی ہے اور بھوکا ہوتا ہے۔ تب ضروریہ اپنے مخصوص انداز میں شور مچاتا ہے۔ فوج میں اس کا استعمال چونکہ

نیا نیا تھا۔ یاد لوگوں نے زیادہ لا دیا یا پھر مار پٹائی شروع کر دی کیونکہ گدھے کے ساتھ پٹائی کا لفظ لازم ملزوم ہے۔ کام نہیں چلا مگر جب اس کی خوبیوں کا اندازہ ہوا تو اس بھی بڑھا اور کام بھی چلا۔ ہر ایک دستے نے اپنے گدھے سنبھالے۔ سات دن کا کھانا پانی اور سلاں لا دا اور چل دیئے جدھر حکم ملا۔ جہاں پانی ملا پانی پیا اور پھر کمی کو پورا کر لیا۔ وقت پرتازہ کھانا کھایا۔ نہ ایمر جنسی راشن کی مصیبت، نہ میٹھی روٹی کا جھجٹ، میٹھی روٹی فوج میں عام چیز ہے۔ ویسے نہایت ہی بکواس چیز ہے۔ امن کے دوران اس کی بڑی ترغیب دی جاتی ہے۔ جہاں کئی دن باہر رہنا ہو۔ کہا جاتا ہے میٹھی روٹی یا ایمر جنسی راشن ساتھ رکھ لو۔ وزن بھی نئی نئی بنی تو لوگس پر گاڑیں بڑی تیزی سے چلانے لگے اور پھر جنگ بھی اپنے شباب پر تھی۔ ظاہر ہے کہ مازٹا بھی زیادہ ہی ہوتے تھے۔ انگریز جنرل کو غصہ آیا۔ تیز رفتاری کو روکنے کے لئے خود گشت کرنا شروع کیا۔ راستے میں ایک امریکن کارپورل جو جھڑے میں اپنے نامک کے برابر ہوتا ہے، چیپ کو پچاس میل کی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ اسے سامنے آیا۔ اس سڑک پر پندرہ میل فی گھنٹہ سے زیادہ تیز چلانے کا حکم نہ تھا جنرل نے اسے روکا۔ مکالمہ نیچے درج ہے۔

جنرل: اس سڑک پر حد رفتار کا تمہیں علم ہے؟

کارپورل: میرے فرائضوں کو بھی نہیں پتہ کہ حد رفتار کیا ہوتی ہے۔

جنرل: اس سڑک پر پندرہ میل فی گھنٹہ سے تیز چلانے کا حکم نہیں۔

کارپورل: (اڈا یوس ہو کر اور کچھ سمجھلاتے ہوئے) جو آپ کہتے ہیں ٹھیک ہی ہوگا، مگر یاد رکھیں

کہ لڑائی کبھی بھی پندرہ میل فی گھنٹہ کے حساب سے نہیں جیتی جاسکتی۔

ہاں تو بات حرکت کی تھی کہ فرنگی بیشک ایک دن میں پندرہ میل مع خجروں کے چلتا ہو مگر یہاں

اگر قبائلیوں سے مقابلہ کرنا ہے تو جناب کم سے کم تیس میل روزانہ چلنا ضروری ہے اور پھر اسی طرح کم سے کم سات

دن باہر گزرنے بھی ضروری ہیں۔ ورنہ بات نہیں بنتی۔ مقابلہ پھر مقابلہ ہے اور وہ جی حرکت کا۔

شروع میں جب یہاں پہنچے تو نہ زمین کا پتہ اور نہ حالات کا۔ کتابیں تو علاقے کے بارے میں بہت

بڑتی نہیں مگر کتابوں سے ہی اگر سب کچھ سیکھ لیا جاتا تو پھر عمل پر زور دینے کی کیا ضرورت۔ ہاں یہ صحیح

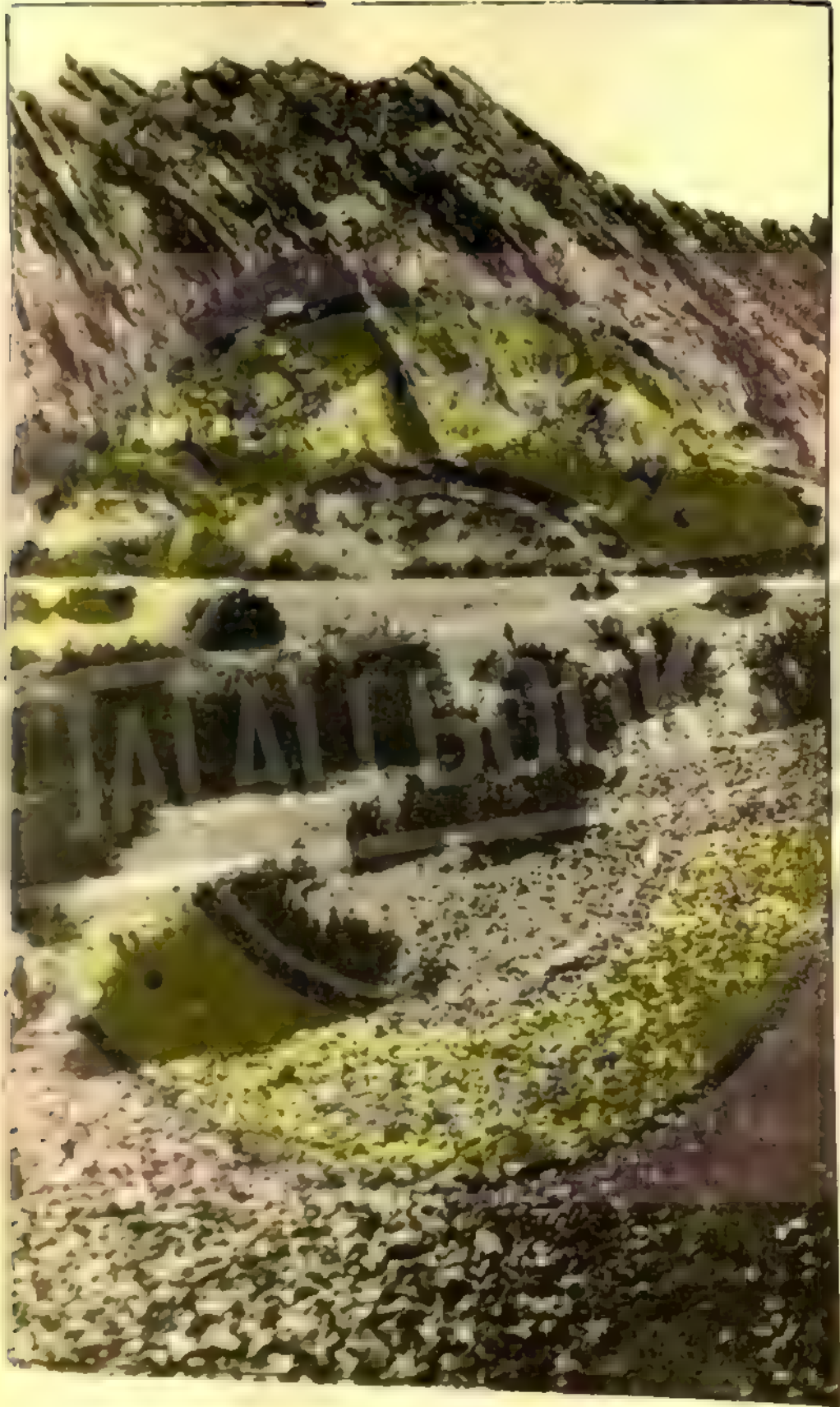
ہے کہ عمل میں آسانی ہو جاتی ہے۔ حرکت میں برکت تو جناب گشت ادا قدمی کار روایاں شروع ہو گئیں ادا قدمی کار روای سے مراد بڑے چمانے پر ملائے کو چھانا۔ اب جہاں تک گاڑیاں جاسکتی تھیں تو کار روای کچھ مشکل نہ تھی۔ اس سے آگے جانے کے لئے سامان خوراٹھا کر چلے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن میں پندرہ میل۔ کھانا اور پانی ختم تو پھر واپس۔ اول تو وہ انتہا درجے کا بے وقوف ہو گا جو واردات کر کے سڑک کے کنارے بیٹھے۔ یا لوگوں نے اپنی کار روای کی اور دور پڑاؤ کی طرف نکل گئے۔ کچھ انہیں تلاش پڑاؤ تک پہنچنے کے لئے حرکت چاہیے۔ وہ بھی مد مقابل سے تیز۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بغیر تیز رفتاری اور پھر ایک دو کم اور پیٹ بھی بھر جاتا ہے۔ یہ چیزیں خراب نہیں ہوتیں کچک کی نہ تک تو ٹھیک ہے مگر جہاں میں میل روزانہ چلنا ہو اور وہ بھی کئی دن تک وہاں بیٹھی روٹی سے کام نہیں بنتا۔

جب اپنے آپ کو ان خطوط پر آراستہ کر لیا تو پھر نہ کھانے کی فکر نہ پانی کی کیا بالی کا ڈر پہاڑ میں تو ہوا کریں۔ پانی ناپید کوئی فکر نہیں۔ چلنے کا مقابلہ ہے تو یہی سہی۔ ہمارے مری دوست اکثر ہم سے کہا کرتے ہیں کہ آپ لوگ بالکل مری بن گئے۔ کیا حرج ہے اگر اپنے بجائوں سے نہیں سیکھیں گے تو کن سے سیکھیں گے آخر آپ لوگوں کا مدیوں کا تجربہ ہے۔ ان صدیوں میں نہ زمین بدلی اور نہ ہی حالات اگر سڑکیں ہوتیں اور حالات موجودہ صدی کے ہوتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی:









ان پیاروں کے دامن میں ان کا "حلق" ہے

## گشت اور جدت

جب ہم نے اپنی حرکت درست کر لی اور اس میں خاطر خیرہ کامیابی ہوئی تو ہمارے دوستوں نے آئے بھی سوچنا شروع کیا۔ جب حالات اور انتشار اپنی نوعیت کے ہوں یعنی نہ تو حالات پر امن اور نہ ہی گڑبڑ جنگ سے مناسبت رکھتی ہو تو پھر ان سے نمٹنے کے نئے طریقے بھی نہ ہوں ضروری ہیں نئے طریقوں کو بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر قوی ذہن جیسی، ہمارے ایک خاص انداز نہیں سمجھا جوتا ہے۔ ایسا تو ہو ہی جاتا ہے۔ گھٹک کوئی بات نہیں۔

ایک روز ہمیں کھانے پر گئے تو بڑے تھکے ایک کپتان صاحب ہمارے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ نو عمر، ہم سے کافی لمبے اپنے کام میں کافی مستعد اور ماہر۔ انہوں نے بھی مری علاقے میں آکر دائرہ رکھ لی۔ زبان بھی اچھی خاصی بولتے ہیں۔ اگر شلوار قمیض میں ہوں تو بالکل مری نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بات جس کے کہنے کے لئے بے تاب ہیں۔ پہلے تو علاقے کے حالات پر تبصرہ کرتے رہے۔ انہیں کچھ باتیں پسند نہ تھیں۔ آخر اس طرح گشت کرنے سے کیا فائدہ دس پندرہ میل ہم گھوم کر آ جاتے ہیں۔ ملتا ملتا کچھ نہیں۔ ناخن ہی ٹوٹتے ہیں۔ ناخن اگر ٹوٹتے ہیں تو انہیں کاٹیے۔ کس نے کہا ہے کہ بڑھا کر رکھیں۔ نہیں یہ تو انہوں نے محاورہ لکھا

تھا آپ سمجھے نہیں تو پھر کیا کیا جائے۔! دراصل بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں یہ تمیز کرنا کہ فلاں دوست ہے یا خریب کار بہت ہی مشکل ہے۔ اس کے پہچان تو گولی چلنے پر ہی ہوتی ہے۔ یا پھر آدمی بغیر اجازت کے ہتھیار لے جا رہا ہو۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہر ایک کو وردی دور سے نظر آتی ہے۔ اب گشت پر ابھر نکلے۔ دور سے ہر ایک کو پتہ ہے۔ ہم واپس آگئے۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ گشت واپس چلا گیا ہے اور علاقہ صاف ہے۔ جو مرنے آئے کرو۔ خریب کار ہمارے قریب آتے ہیں۔ واردات کرتے ہیں اور پھر بھی پہچان مشکل۔ ہم جہاں بھی جلتے ہیں، ہمیں چونکارنا پڑتا ہے۔ کچھ غیر یقینی سی محسوس ہوتی ہے۔ بات تو ٹھیک ہے علاقہ تو غیر محفوظ ہی رہے گا۔ جب تک خریب کاروں کو گرفتار نہیں کر لیا جاتا۔ ان لوگوں کا مسافرا کرتے کرتے بھی وقت لگے گا۔ یہی کوشش جاری بھی رکھنی پڑے گی۔ یہ تو دور رس کام ہے مگر فی الحال ضرورت اس بات کی ہے کہ جو غیر یقینی ماحول ہم محسوس کرتے ہیں وہی خریب کاروں کے لیے پیدا کر دیا جائے اور انہیں ہر ایک علاقہ غیر محفوظ نظر آئے تو ان کی کارروائی میں بہت حد تک کمی ہو جائے گی خریب کار ہم سے دور اپنی کمین گاہیں چنتے ہیں اور وہ آرام سے گھومنے پھرتے ہیں۔ اگر گشت اس علاقے میں گیا تو لوگ انہیں فوراً بتا دیتے ہیں اور وہ بھی ہتھیار چھپا کر اوروں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ بتائیے اس گشت سے کیا فائدہ۔ فائدہ تو یہ ہے کہ لوگوں کو پتہ ہو کہ ہم یہاں آتے ہیں۔ یہ ابھی رہی آپ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ بات برابر ہو گئی خریب کاروں کی کارروائی میں کیا فرق پڑا۔ جب تک آپ موجود ہیں شاید کوئی کچھ نہ کرے۔ بعد میں تو اپنی حکومت ہے۔

”اچھا تو آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”فی الحال تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتا صرف عرض ہے کہ آپ مجھے چالیس آدمی لے دیں اور جس دن ایک مجھے اکیلا چھوڑ دیں جیسے میری مرضی آئے انہیں تربیت دوں۔ جب تربیت کا کام مکمل ہو جائے تو آپ آکر دیکھیں۔ اگر میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر مجھے کام کرنے کی اجازت دے دیں۔ پکتان غریب مجھ سے بات کر رہا تھا مگر اور لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ بحث ہے کہ جاری ہے۔ مگر وہ سب بارمانا تھا جو کچھ کہہ رہا تھا اُسے مکمل یقین تھا کہ ٹھیک ہے۔ چلو مان لیا۔ اس کی نوکری تھوڑی ہے مگر جذبہ تو



ہے۔ اور پھر یقین بڑی بات ہے۔ جذبہ اور یقین ہو تو کامیابی اور کامرانی قدم چومتی ہے۔ چلو مانے جیتے ہیں۔ تمہاری تمام شرائط منظور۔ لوگ مذاق اڑاتے ہیں تو اڑانے دو۔ ہر ایک جدت کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔

ایک سو دن پہنان صاحب وعدے کے مطابق تشریف لائے کہ چلیے میرے ساتھ اور تربیت کا معائنہ کر لیں۔ جیپ خود چلا ہے تھے۔ راستہ کچھ نظر نہیں آتا تھا مگر جیپ ہے کہ جا رہی ہے۔ کبھی پتھر دوں پڑ دھکے کھاتی ہے تو کبھی نالے ک ریت میں دھنسی جاتی ہے۔ پانچ میل چلے ہوں گے کہ ٹھیکس بدل گئیں۔ گردے منڈائے ہوئے۔ آنکھیں لال ہو کر خاکی منہ پر چمکنے لگیں۔ مٹی پسلی کا جو حال تھا بیان کرنا مشکل ہے کتنی دور اور جا ہے یہی کوئی دو ایک میل اور۔ دھنی رام کا قلعہ آیا۔ دل ہی دل میں شس لئے قصہ آپ بھی سن لیں۔ یہ ۱۹۶۵ء کی لڑائی کا ذکر ہے۔ میں اس وقت کمپنی کمانڈر تھا۔ میری کمپنی آگے آگے تھی رات بھر ہم لوگ چلتے رہے صبح بیٹی تو کوئی پتہ نہیں ہم لوگ کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اتفاق سے دو آدمی بھاگتے ہوئے نظر آئے ایک کو بارہ لوگوں نے دھر لیا اور گھسیٹنا شروع کیا۔ یہ ہی کوئی ادھیر لڑکا تھا۔ سینڈھوٹی اور کالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بھاگ کر منع کیا ایسا نہ کرو۔ نام دھنی رام بتاتا تھا۔ جب ہم منع کرنے لگے کہ اسے مت گھسیٹو تو واہ رے حاضر جوابی۔ کچھ پنجابی کچھ اردو میں کہنے لگا۔ ٹھیک ہے اب تہاڑے قابو آگئے جو مرضی آئے کر لو۔ تو جناب جیپ پر ہماری یہ حالت تھی۔ جیپ ایک نالے کے کنارے جا کر رکی۔ تھوڑی دور جب پہاڑی پر پیدل چڑھ کر پہنچے تو نیچے کچھ جھگیاں نظر آئیں۔ غور سے سینڈھوٹی نما جبہ پہنے ہوئے۔ سر پر چادر۔ چلوئے اوپر ٹورا رکھا ہوا۔ کسی کے ماتھے پر گھٹری پھنسی ہوئی اور گھٹری کمر پر جھوٹی ہوئی یہ چھوٹے بچوں کو اٹھانے کا مخصوص انداز ہوتا ہے۔ کوئی مشکیزہ اٹھائے پانی لاری ہے۔ جھگیاں پہاڑ کے دامن میں اس طرح نصب ہیں کہ جب تک آپ سر پر نہ پہنچ جائیں کچھ نظر نہیں آتا۔ جھگیوں کے ایک طرف آگ جل رہی تھی۔ پتھر کا توار کھا ہوا اور روٹیاں بن رہی ہیں ایک طرف چکی پڑی ہوئی۔ گدھے ارد گرد چر رہے ہیں۔ کچھ مرغیاں بھی ہیں۔ کبھی جھگیوں کے باہر جاتی ہیں اور کبھی اندر جاتی ہیں۔ رنگین کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے دور دور مرد بھڑی چرا رہے ہیں۔ سر پر گڈی لمبی لمبی اڑھیاں اور تیرن۔ مشکل ہو گیا کہ یہاں آدمی شکار کی تلاش میں بیٹھے ہیں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ قبائلی عورتیں اپنے



بل پڑی ہوئی۔ جہاں جھگیاں نصب تھیں اور سرے کئی راستے گزرتے تھے۔ قریب میں پانی بھی موجود تھا۔  
 کپتان صاحب نے اشارہ کیا تو سپاہیوں کے اوپر سے گڑیاں اٹھنی شروع ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ  
 ہم لوگ شرسپندوں کی گھات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گڑی والے رائفلوں سے مسلح چہرے پر داغی اور  
 بکڑی سے نکلے ہوئے لمبے بال۔ کپتان صاحب نے پھر اشارہ کیا تو دور چوٹی پر سے دو آدمیوں نے سنکالا  
 یہ چوٹی پر بیٹھے آدمی دیدیاں ہیں جن کے پاس دو رہنمیں ہیں یہ ہر آتے جاتے پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مسلح  
 آدمی گھات کی طرف آتا ہو تو اشارے سے گھات کو چوکن کر دیتے ہیں۔ اگلے اشارے پر یہ سب لوگ غائب ہوئے  
 روزمرہ کے کام میں مصروف ہیں آخری اشارے پر دیکھتے دیکھتے سب سے ساکن گدعوں پر لاوا اور چل دیے  
 دیکھنے والا کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ سپاہی جارہے ہیں یا قبائلی۔

ایں سارے مظاہرے کے پس پشت کپتان صاحب کا فلسفہ یہ ہے کہ چونکہ یہاں علاقہ بہت وسیع  
 ہے۔ آپ کتنے ہی دستے لے آئیں ہر جگہ موجود ہونا مشکل ہے۔ ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جہاں تخریب کار اپنی  
 مرضی سے گھومتے پھرتے ہیں اور جب موقع ملا اپنی کارروائی کی اور غائب۔ اس کارروائی کو روکنے کا  
 ایک طریقہ گشت ہے۔ گشت کی خامیاں تو انہوں نے پہلے ہی بیان کر دی تھیں۔ اب اگر اس قسم کے دستے  
 جن کا انہوں نے مظاہرہ دکھایا۔ ایسے علاقے میں تعینات کر دیے جائیں۔ جہاں تخریب کار اپنے آپ کو  
 محفوظ سمجھتے ہیں اور جس جگہ سے وہ تخریب کاری کے لیے آتے جلتے ہیں تو ان کے لیے وہ ہی حالات پیدا کر دیے  
 جائیں گے جو کہ ہمارے لئے ہیں انہیں یہ نہیں پتہ کہ کون سا علاقہ محفوظ اور کون سا غیر محفوظ ہے۔ کوشش  
 یہی ہو کہ فائر کھولے بغیر تخریب کاروں کو گرفتار کیا جائے۔ آخر کو اپنے ہی بجائیں۔ اس طرح گھات  
 لگانے سے یہ مقصد بھی حل ہو جائے گا۔ بات دل کو لگی۔

اس قسم کے دستے جن کا مظاہرہ کپتان صاحب نے دکھایا تھا چنے اور علاقے میں پھیلا دیے گئے اور  
 نہایت کامیاب رہے۔ اس سے یہ تو ہوا کہ تخریب کاروں نے نزدیک آنا ترک کر دیا اور پھر ان میں گھبرائٹ  
 بھی ہوئی جو کہ لازمی امر تھا۔ خبریں بھی بہت اہم ملیں۔ جن کی بنا پر بڑی اقدامی کارروائیاں کامیاب  
 ہوئیں۔ مگر حالات اس تیزی سے بدلے کہ انہیں ترک کرنا پڑا مگر اس میں شک نہیں کہ حدت کا اپنا  
 مقام قائم ہے۔





جہان بی اور سیوی اپنے والد کے ساتھ

## ایک دن اور ایک صدی

### مری قبائل کا رہن سہن!

یہاں کے حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ رنج شدہ معاشرے اور رہن سہن پر مبنی ایک نذر ڈالی جائے۔ پہلے معاشرے کو لے لیتے ہیں۔ اس کا تجزیہ اگلے باب میں دہرائی، نقطہ زکاہ سے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر یہ خیال رکھیے کہ یہ ہماری ذاتی رائے ہے کسی ماہر غرائیات کی نہیں۔

مری قبائلیوں کی اثریت بغیر گھروں کے رہتی ہے اور ایک محتاط انداز سے کے مطابق یہ مناسب نوے فیصد تک بھی زیادہ ہے۔ آرام سے رہنا کے برعکس ہے۔ جب بھی ہم باہر جاتے ہیں ان کی جھگیوں کو دیکھتے۔ سوال: اسے ذہن میں اٹھتے اور گرد بڑھتی کہ ہمارے بھائی اگر اس طرح جھگیوں میں رہتے ہیں تو ان کا طرز زندگی کس نوعیت کا ہوگا۔

ان کا اس طرح جھگیوں میں رہنے کا طرز زندگی صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ ہم نے ان کی جھگیوں کو غور سے دیکھا شروع کیا۔ اپنے بھائیوں سے بھی استفسار کیا۔ جب بھی موقع ملتا ان کے ساتھ جھگیوں میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں ہوتیں اور جس کی میری کرتے اس دوران ہم نے اپنے نوٹس: NOT بھی تیار کیے



کہ کبھی وقت ملا تو آرام سے اس کا تجزیہ کریں گے۔ اس معاملے میں اپنی کم علمی کا بھی خاصہ احساس ہوا چلے  
کوئی بات نہیں کہ کسی کسی پڑھے لکھے کو اس کا خیال آیا تو شاید اس سے بہتر تجزیہ کر ڈالے۔ تاہم ایک بات واضح  
کہ نامزدی ہے کہ جو کچھ بھی بیان کر رہے ہیں اس میں مبالغے کو کوئی دخل نہیں۔

ہمارے مری بھائی جہاں بھی جھگیاں نصب کرتے ہیں چاہے امن ہو یا جنگ ان جھگیوں کا پتہ کرنا  
بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ آپ اپنا کم سر پہنچ سکیں۔ یہ جھگیاں عموماً ایسی جگہ لگائی جاتی  
ہیں جہاں سے ان کا پتہ چد: مشکل ہو۔ قریب گھرے مالے ہوں گے۔ بڑے بڑے پتھر اور اس پاس اونچے  
پہاڑ۔ اگر کچھ درخت ہوں تو اور بھی اچھا ہے۔ جب جھگیاں لکڑی اور چٹائی سے نصب کی جاتی ہیں تو  
خیال یہ رہتا ہے کہ وہ زمین کی قدرتی حالات سے اس طرح مل جاتیں کہ گھروں کا کوئی پتہ نہ چل سکے فوجی  
اصطلاح میں اسے تلبیس یا کیمو فلیج (CAMOUFLAGE) کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر پتہ چل  
کو دیکھیں تو وہ بھی کیمپ لگاتے ہیں مگر میوں میں رہتے ہیں جن کی چھت کالے رنگ کے کمبل کی ہوتی ہے  
جنہیں میلوں سے پہچانا جاسکتا ہے مری بھائیوں کی جھگیاں جہاں بھی نصب ہوں ان کی نام تعداد نہیں  
ہوتی۔ کہیں پانچ کہیں چھ۔ کہیں آدھے چکر کی شکل میں کبھی ہوتی۔ ان پانچ چھ جھگیوں کے گروپ  
میں ایک خاندان ہوتا ہے۔ ایسے جھگیوں کے پانچ چھ گروپ ایک بڑے خاندان کی شکل اختیار کرتے ہیں  
جنہیں ملن کہتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے یہ رہنے والے ایک ہی بروی قبیلے ہوتے ہیں۔ یہ اٹھانے کا  
طریقہ آپس میں اتارا چاہتا ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی یہ بیٹھتے ہیں ان کی گروپ بندی ہمیشہ قائم  
رہتی ہے۔

ہمارے مری دوست اکثر ہمارے پاس آتے کہ فلاں جگہ سڑک بنوا دیں یا فلاں جگہ پانی کا بندوبست  
نہیں وغیرہ وغیرہ تو ہم اکثر ان کے ساتھ خود چلے جاتے۔ ایک دن خیال آیا کہ ان کے کیمپ میں پورا دن گزار  
جائے اور کیمپ کی تفصیل اپنی آنکھوں سے دیکھی جے۔ ایک روز ہمارے ایک دوست چند کوئلے کی بوریاں  
لے کر ان موجود ہوئے کہنے لگے یہ دیکھئے پتھر کے کوئلے کا نمونہ ہے جو کہ ہمارے ملنے میں موجود ہے آپ کو تو  
معلوم ہے آج کل یہ کوئلہ سونے کے بھاؤ بہتا ہے۔ دکان میں لوگ اسے چھ سو روپے ٹن کے حساب سے بیچتے

ہیں۔ ہم نے کوئلے کو دیکھا واقعی بہت عمدہ تھا۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس بارے میں ان کی کیا مدد کی جاسکتی ہے کہ خود ہی بولے۔ اگر آپ اس علاقے میں سڑک بنوادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ بالاد کے تک تو سڑک ہے اس سے دس میل آگے اس سڑک کو اور بڑھانا ہوگا۔

”چلیے ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں علاقہ بھی دیکھ لیں گے۔“

”ارے آپ کہاں جائیں گے۔ پیدل چلنا پڑے گا۔“

”جناب! ہم پیدل چلنے کے عادی ہیں ایسی بھی کیا بات ہے۔“

”یہ تو میں پتہ ہے لیکن بلاوجہ آپ کو تکلیف ہوگی۔“

ہم نے انہیں سمجھایا کہ بغیر تکلیف کے کام بھی نہیں ہوگا۔ ہمارے چلنے سے اس کام میں بڑی آسانی ہو جائے گی اور وقت کی بھی بچت ہوگی۔ ہمارے دوست فوراً تیار ہو گئے۔ بنانے لگے کہ ان کا کیمپ بھی اسی جگہ کے قریب ہے اور مال مویشیوں کی جراثی کے لیے ان کے فرنیسے دگ وہیں موجود ہیں۔ اگلے دن ہم اپنے دوست کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ گاڑیاں بالاد کے ہی میں چھوڑیں۔ گھوڑوں کا بندو بست ہمارے دوست نے کر ہی لیا تھا کہ ہمیں پیدل کیوں تکلیف دی جائے۔ جب گھوڑے پر سوار ہوئے تو ہمارے دوست کہنے لگے کہ آج آپ ہمارے بہان ہیں۔ واپسی تو پھر دیر سے ہوگی۔

”چلیے آپ کی بہانی مر آنکھوں پر۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے بہان ہیں تو آپ کے ساتھ اکیلے ہی چلتے ہیں۔“

اپنے ساتھیوں کو واپس کیا اور پہاڑی کا راستہ تیار گھوڑوں کی سواروں کی ویسے اپنی عمر میں کم ہی کی ہے مگر یہ گھوڑے کچھ اس طرح چلتے ہیں کہ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ سب سائے گھوڑوں پر دوڑی تھے۔ پہلے ہم اور ہمارے دوست اس طرح چلے گئے تھے بھی تین سوار۔ مطلب یہ کہ چلنے کا پرکا فوجی طریقہ۔ راستے میں ہمارے دوست بتاتے رہے کہ کہاں سے سڑک شروع کی جاسکتی ہے۔ دراصل یہ ان کا پیدل جانے کا راستہ تھا۔ قریب دوپہر ہم اس جگہ پہنچے جہاں کوئلے کی کان موجود تھی۔ برسات میں ایک نالے نے اپنا رخ بدلا تھا اس سے منسلک پہاڑی کٹ گئی تھی اور کوئلہ اوپر آ گیا تھا۔ یہ کوئلے کی تہ دور تک نظر آتی تھی جب ہم جگہ

دیکھ چکے تو ہمارے دوست نے کہا کہ قریب میں نمک بھی موجود ہے ہیں تجیس تو تھا ادھر بھی چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چشمے کے قریب پہنچے وہاں نمک کے آثار دکھائی دے رہے تھے اس پاس کی زمین نمک کی فراوانی سے سفید ہو گئی تھی۔ چشمے کا پانی پکھا تو نمکین۔ ہمارے دوست نے بتایا کہ اس چشمے کا پانی سکھا کر ہم لوگ نمک بناتے ہیں۔ کوہلو میں تو آپ کو معلوم ہے کہ نمک کی قیمت دو روپے سیر ہے۔ چشمے کا پانی رس رس کر بہہ رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نمک کی کان قریب ہی ہوگی۔ ہمارے دوست کہنے لگے کہ اگر یہاں سرک بن جائے تو کوئلے اور نمک دونوں کا کاروبار ہو سکتا ہے۔

دیر کا فی بوجھ تھی اب ہم لوگ واپس لوٹے۔ ایک ماٹے کے ٹوڑ پر ہم سے کے جو دو آدمی گھوڑوں پر چڑھ گئے اور آہستہ آہستہ گہرے ماٹے کی طرف چلنے لگے۔ ہم نے ان کے گھوڑوں سے نیچا اترنے کی وجہ پوچھی تو جواب ملا "ہمارا حلق قریب ہے۔ یہ ہم لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ حلق سے تقریباً سو گز پہلے سے والا اتر جاتا ہے اور آہستہ آہستہ آگے آتا ہے تاکہ آدمی کی پہچان ہو سکے۔"

ہم اپنے دوست سے مخاطب ہوئے کہ اب ہم وہاں کریں گے جو آپ کا رول ہے۔ ماٹے کے کنارے ایک گڈڑی تھی جو ایک چھوٹی سی پہاڑی پر سے گزرتی تھی۔ جیسے ہی ہم نے پہاڑی کو عبور کیا سامنے ایک گہرا نالا آیا اور اس کے ساتھ اونچا پہاڑ۔ پہاڑے دامن میں چھوٹے چھوٹے گردپوں میں جھگیاں نصب تھیں۔ وہاں کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ یہ ہمیں ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی جگہ پر لے گئے سب کافی تھک چکے تھے۔ اس لیے اتر کر کنبوں پر بیٹھ گئے جو کہ وہاں پہلے سے بچھے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا کہ "پہلے آپ ہیں یہ بتائیں کہ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں کیا یہ پہلے سے منتر کی گئی تھی؟"

"جب ایک نیا آدمی حلق کی طرف آتا ہے تو کچھ لوگ اس کا استقبال کرتے ہیں اور اسے ادھلے آتے ہیں جہاں آپ بیٹھے ہیں۔ یہ چھوٹا سا کھلا علاقہ آؤٹاک کہلاتا ہے۔"

تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہمارے میزبان نے ہم سے معذرت چاہی اور کہنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنا حال کاروان مکمل کر لیں۔

ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے حال بیان کرنا شروع کیا۔ اس رواج کا ذکر ہم پہلے کر چکے

ہیں جب وہ "حال" بیان کرچکے تو کیمپ کے ایک بزرگ نے جواباً "حال" بیان کیا۔ ہمارے دوست نے بتایا کہ ہر ایک کیمپ کا ایک لیڈر ہوتا ہے۔ یہ عزت اور مرتبہ کے لحاظ سے سب سے بڑا ہوتا ہے جیسے "خلق" و "اجا" کہتے ہیں۔ اگر خلق و اجا کسی کام سے باہر جاتا ہے تو دوسرا عزت دار آدمی اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ تو یہ بزرگ ہمارے دوست کی غیر موجودگی میں خلق و اجا کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اگر کوئی اجنبی یہاں پہنچ جائے تو اس سے کوئی اور سوال نہیں کر سکتا۔ تاؤ فیکہ خلق و اجا صاحب نہ پہنچ جائیں سوال جواب تو وہ "حال" سے ہوتا ہے۔ اجنبی کو یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ خلق میں کون کون موجود ہے۔ غیر موزوں سے باز میں کچھ بتانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جھکیاں تین گروپوں میں تقسیم تھیں۔ ہمارے میزبان نے بتانا شروع کیا کہ ہر ایک گروپ اور چھگی کی اپنی حدود ہوتی ہے۔ برابر والے کا احترام کرتے ہیں۔ اس طرح سے ایک قسم کا پردہ سا قائم رہتا ہے۔ جسے انگریزی میں پرائیویسی (PRIVACY) کہتے ہیں۔ بار سے آنے والا مہمان آؤ تاک "میں ہی قیام کرتا ہے۔ ہاں اگر اسے کوئی شخص جانتا ہو اور ساتھ اپنی جگہ میں لے جانا چاہے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں۔ منام کو مرد علیحدہ "خلق و اجا" کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور ملاقات چیت ہوتی ہے۔ یہ اکٹھا ہونا کوئی تخریب کی طرح نہیں ہوتا۔ بس یوں ہی آرام کرنے کے لیے اور گپ لگانے کے لیے۔ اس طرح عورتیں خلق و اجا صاحب کی بگم صاحبہ جنہیں گوری کہتے ہیں کے ملنے میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

صبح اور شام کے وقت کیمپ میں کافی ہنگامی ہوتی ہے۔ یعنی ہانور چرائی کے لیے نکلتے ہیں یا واپس آتے ہیں اس کے علاوہ اور کام بھی ہوتے ہیں۔ جیسے پانی لانا۔ لکڑی کا ٹکڑا پھرنے خلق کے آدمی کو باہر جانا ہوتا ہے تو ایسی کو واپسی کا انتظار ہوتا ہے "خلق و اجا" صاحب ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر جو کہ کیمپ کے عموماً وسط میں ہوتی ہے۔ ان کاموں کو دیکھتے ہیں اور احکام صادر کرتے ہیں۔

ان جگہوں کے آس پاس تقریباً ہر ایک جھگی کا علیحدہ اپنا علاقہ ہوتا ہے جہاں عورت اپنے گھر کا کھانا پکاتی ہے کوئی بھی مرد دوسرے کے علاقے میں نہیں جاتا۔ بچے آپس میں ضرور کھیلتے رہتے ہیں لیکن رات کو اپنے خاندان ہی کی جگہوں میں سوتے ہیں۔ انہیں بھی ایک دوسرے کے علاقے میں سونے کی اجازت نہیں ہوتی۔



”آپ کے پورے وطن کا ایک ہی ”اڈاک“ ہوتا ہے۔“

نہیں اگر آپ جھگیوں کو غور سے دیکھیں تو ہر ایک نے تھوڑی سی زمین چھوڑی ہوئی ہے وہ ان کا اپنا نجی ”اڈاک“ ہے یہ مہانوں کے لیے وقف ہے۔ مورتیں جہاں کھانا پکاتی ہیں یہ سب سے اہم جگہ ہوتی ہے۔ اس جگہ سوائے گھر کی مالک بچوں اور عورتوں کے کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ چولہا جھگی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ ہمارے دوست کی والدہ اور بیوی میں بہت اچھی طرح جانتی تھیں کیونکہ جب یہ حراست میں تھے تو ہم اکثر ان لوگوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے وہاں جاتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی والدہ نے اپنے بیٹے سے ملنے

کی خواہش ظاہر کی تو ہم انہیں اپنے ساتھ ملانے بھی لائے تھے اور ان کے بچے کو علاج کی خاطر اپنے پاس بھی رکھا تھا۔ ان کی والدہ کو ہماری آمد کا پتہ چلا تو ٹھٹھنی ہوئی ”اڈاک“ میں آگئیں۔ یہی کوئی سولہ سال کی بیٹی تھی۔ ہاتھ اپنی انگلیوں سے لگایا۔ مہاکثر انہیں اس حرکت پر ٹوکتے تو برائیاں تھیں۔ پھر کہنا ہی چھوڑ دیا۔ ان سے استفسار کیا کیا کہ آپ کا پوتا کہاں ہے؟ ہم اپنے ساتھ علاج کے لئے لے گئے تھے۔ کہنے لگیں سو رہا ہے، ہم سے رہا گیا وہ اسے لانے کے لئے واپس جانے لگیں۔ اسے مت اٹھائیں۔ بچے کو تکلیف ہوگی ہم آپ کے ساتھ خود چلتے ہیں۔ باقی سب لوگ وہیں بیٹھے تھے ہم اپنے دوست اور ان کی والدہ کے ہمراہ جھگی کے قریب پہنچے۔ پاس ہی چوہا رکھا ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ روٹی بنا رہی تھیں جھگی کے ایک طرف چکی پڑی تھی۔ قریب بوری میں سندھ بھرتی تھی۔ کچھ برتن ایک طرف رکھے تھے۔ دوسری طرف بستر لگا ہوا تھا اور نیچے آرام سے سو رہا تھا میرے پاس بچے کے لئے کچھ کھلونے بھی تھے۔ منہ کرنے کے باوجود دادی نے بچے کو اٹھا دیا۔ صاحبزادہ کھلونے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ہو گیا۔ جھگی کے ایک کونے میں ایک کس بھی رکھا ہوا تھا اس میں کپڑے اور قیمتی اشیاء جیسے زیور وغیرہ رکھا جاتا ہے۔ کچھ مشکیزے بھی لٹکے ہوئے تھے ان میں سے کچھ پانی کے لئے دتے ہیں باقی میں سکون وغیرہ رکھ لیا جاتا ہے۔ کچھ ڈبوں میں نمک چینی اور چائے رکھی جاتی ہے۔ باہر اون کی بنی ہوئی بوریاں اور سیال پڑی تھیں۔ یہ گدھے پر سامان لادنے کے کام آتے ہیں۔ جھگیوں سے تھوڑی دور جانوروں کے لئے جگہ تھی۔ سردیوں میں یہ جگہ بڑی جھگی کی شکل میں بنائی جاتی ہے۔ رات کو جانوروں کی حفاظت کے لیے مرد جانوروں کے پاس ہی سوتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہم نے اپنے میزبان سے

پوچھا کہ آپ لوگ کب تک اس جگہ مقیم رہیں گے۔ اس سے پہلے تو ہم آپ سے "مٹھی کھوئی" کے پاس ملے تھے۔  
 ہمارے دوست نے بڑی وضاحت سے بیان کیا کہ کیمپ منتقل کرنے کے لئے کئی باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ دراصل  
 یہاں سپرنٹنڈنٹ کے تین ہی پیشے ہوتے ہیں۔ جانور پالنا، کھیتی باڑی کرنا یا پھر کسی جگہ محنت مزدوری مل گئی تو  
 روزی کمالی۔ جہاں تک زمین کا تعلق وہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نجی زمین تو صرف وڈیروں یا سردار کی ہے باقی  
 زمینیں قومی ملکیت ہیں۔ وڈیروں کی زمین تو آبائی پیسے سے ہی انہیں کے پاس ہیں۔ قومی ملکیت کی زمینیں جنوری قبیلوں  
 میں ہی ہوتی ہیں۔ تھوڑی بہت آباد ہیں تو اس میں صرف ایک ہی فصل لگتی ہے۔ جب فصل کا زمانہ آتا ہے تو لوگ  
 اپنے کیمپ اور محلے آتے ہیں فصل لگائی پھرتی چراگاہ اور روزی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ جو لوگ  
 وڈیروں یا سردار کی زمین پر کام کرتے ہیں وہ کسی حد تک ایک جگہ رہتے ہیں یا کام کے وقت آجاتے ہیں۔ اب  
 جانور پالنے کے پیشے کو لیجئے۔ جانور زیادہ تر وڈیروں کے ہوتے ہیں یا پھر خاندانوں کی ملکیت۔ خاندانوں میں  
 ان کا آپس میں بٹوارا بھی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مال چرائی کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوتی باقی لوگوں  
 کو بھی روزگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے مونا کیمپ ایسی جگہ چننا ہوتا ہے۔ جہاں روزگار کے اور مواقع بھی ہیں  
 فی الحال تو مواقع یہ ہی ہوتے ہیں کہ کسی اور کی زمینوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ سردیوں میں زیادہ تر لوگ سندھ  
 یا آس پاس کے علاقے میں چلے جاتے ہیں۔ ایک تو جانور سردیوں سے بچ جاتے ہیں دوسرے پیسے کمانے کے مواقع  
 بھی اچھے ہوتے ہیں۔ جب سے سرکاری مینی شروع ہوئی ہیں۔ آبادی کا زیادہ تر طبقہ ان پر کام کرنے لگا ہے جب  
 کبھی کیمپ منتقل کیا جاتا ہے تو ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ لوگ منتشر ہونا شروع ہو جاتے  
 ہیں۔ اب "ملق" وادیا کی صلاحیت اور خوبی اسی میں ہے کہ کس طرح وہ سب کو اکٹھا رکھتا ہے۔ "ملق" وادیا اپنے  
 اپنے قبیلوں کے وڈیروں کو جوبل دے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر وڈیرے سال میں کچھ عرصہ اپنے حلقوں کے ساتھ گزارتے  
 ہیں کیونکہ اپنے جانوروں کو خود بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ پھر اپنی زمینوں کے لئے بھی آدمیوں (مزدوروں) کی  
 ضرورت ہوتی ہے۔ ایک طرح سے وڈیروں کی قوت۔ یا جزوی قبیلے کی طاقت اس پر منحصر ہوتی ہے کہ حلقے  
 کس طرح اکٹھے ہو کر رہتے ہیں اور یکاگت قائم رہتی ہے اس طرح عام آدمی کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور اسے اپنی جان  
 مال اور خاندان کی بھی حفاظت مہیا ہوتی ہے۔ اس قسم کے ماحول میں حفاظت مہیا ہونے کا اور کوئی طریقہ

کبھی نہیں۔ اب ہمارے دوست نے بتانا شروع کیا کہ "حلق" کے لوگ زیادہ تر اکیلے ہی کام کرتے ہیں ایسا کام تو اس وقت ہوتا ہے جبکہ بیٹریوں کی اون آٹاری جاتی ہو یا پھر جانور گم ہو جائیں یا کوئی باہر والا کیمپ کی حفاظت پر ہاتھ ڈالے۔

مورتی اکثر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں جیسے کہ پانی لانا ہو، لکڑیاں کاٹ کر لانی ہوں یا "پیش" کے پتے اکٹھے کرنے ہوں جس کی چٹائیاں، رسیاں اور پتیل بنے جلتے ہیں۔ کھانا وغیرہ تو خیر وہ اکیلے ہی بنتی ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر کپڑے بنانے میں ایک دوسرے کی بھی مدد کرتی ہیں۔

جانور چرانے کے لئے عموماً زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آٹھ نو دس آدمی اس کام کو بخوبی سر انجام دے سکتے ہیں۔ بچے اور بوڑھے بھی یہ کام کرتے ہیں۔ ایسے علاقے میں جہاں لڑائی جھگڑے کا ڈر ہو تو پھر حفاظت کے لئے مال چرائی کے سلسلے میں زیادہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ صبح سے چلے جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں۔

ہمارے میزبان بتانے لگے کہ آج کل ہم لوگ اپنے قبیلے کی مشترکہ زمینوں کے قریب ہیں اور موسم بھی فصل لگانے کا ہے تو کافی آدمی کھیتی باڑی میں مصروف ہیں۔ جب ایک دفعہ فصل لگ جاتی ہے تو پھر نئی چراگاہ کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ فصل کاٹنے کے وقت پھر لگ واپس آ جاتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اگر بارش نہ ہوئی اور گھاس کی کمی رہی تو پھر ہم جہاں کہیں بھی ہوں۔ کچھ آدمی فصل لگانے یا کاٹنے کے لئے قومی زمین پر ضرور آتے ہیں۔ اب جو لوگ اس طرح کام کرنے کے لئے آتے ہیں ان کے ساتھ بیوی اور بہنیں بھی ہوتی ہیں۔ تاکہ ان کا کھانا وغیرہ پکا سکیں۔ عموماً حلقے کے لوگ باہری رہتے ہیں کیونکہ دنیا کے اور کام بھی ہیں۔ سودا سلف لانا ہوتا ہے۔ نئی چراگاہوں کی تلاش بھی ضروری ہے۔ وڈیرے سے ملاپ بھی رکھنا ہوتا ہے ان کے بارے میں کبھی حال "دنیا ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی لادمی ہے کہ اور قبیلوں کا بھی پتہ رکھا جائے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کیمپ میں بہت کم آدمی موجود ہوتے ہیں۔"

"اب آپ کو تو خود معلوم ہے کہ ہمارے یہاں بڑی غربت ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ کچھ خود رو بڑی بوڑھوں یہاں ملتی ہیں جنہیں ہماری عورتیں اکٹھا کر کے لاتی ہیں اور ان کی سبزی بناتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم کی



خود روپیاز بھی: اس کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے۔ ایسے قصبے سننے کے تو ہم بہت شوقین ہیں ہم ذرا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے دوست کہنے لگے کہ ایک غریب عورت کسی دیرے کے گھر کام کرتی تھی عورت کے کئی بچے تھے جب وہ آٹا گوند متی تو جان کر ہاتھ بھرے رکھی۔ ان ہاتھوں پر جو آٹا رہ جاتا ہے اُسے حوکر اپنے بچوں کے لئے روٹی بناتی۔ ایک روز دیرا اس کی اس حرکت پر ناراض ہوا عورت کو غصہ آیا اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے دعا مانگی کہ خداوند تعالیٰ تو ہی کچھ بندوبست کرتا کہ میرے بچوں کا پیٹ بھر سکے اور وہ آرام سے سو سکیں۔ جب عورت نے اس طرح دعا مانگی اور ہاتھوں کو جھٹکا تو باتیں ہاتھ کا آٹا جھاڑا وہاں پیاز آگ آئی اور دائیں ہاتھ کی جھٹکن پر پیش اور جھٹکی بوئیاں جیسے تھوڑے وغیرہ آگے موسم بہار میں بچے پیش کا ساگ کھاتے۔ برسات میں ان کے بیج اور سردیوں کے آخر میں ان کا پھل۔ بہار کے موسم میں پیازوں کے دامن میں تھوڑی کچی ڈنڈیاں نام لگتی ہیں جنہیں وہ پکا کھاتے ہیں اور سردیوں میں وہ انہیں اُبال کر پٹا پیٹ بھرتے ہیں۔ لیکن پیاز ہر موسم میں ملتی ہے جسے دو بے حد پسند کرتے ہیں۔

کہانی سنانے کے بعد ہمارے دوست بتانے لگے کہ کیمپ کے لوگ جب اس طرح آتے جاتے ہوں اور پھر رے کیمپ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہوں تو کسی آدمی کا پتہ چلا کہ وہ کس وقت کہاں ہے مشکل ہوتا ہے اس طرح ہم سب کی آہری کافی پھیلی ہوئی ہوتی ہے لیکن پھر بھی ایک اجتماعی معاشرہ قائم رہتا ہے۔

اس قسم کے ایک اجتماعی معاشرے کا ایک اہم پہلو مشترکہ جانوروں کے رکھنے کا رواج اور مشترکہ کھیتی باڑی کرنے کا طریقہ ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عام آدمی کی تو کوئی زمین ہوتی نہیں صرف قومی زمین ہے۔ جس میں پورے جزوی قبیلے کا حصہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ایک جزوی قبیلہ بڑے خاندان کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں اجتماعی فائدہ زمین اور جانوروں کے پالنے سے ہوتا ہے۔

مشترکہ جانور رکھنے والے ایک جگہ نہیں رہتے نہ ہی ان کا کھانا ایک جگہ پکاتا ہے اور نہ ہی ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ہر ایک شادی شدہ عورت عموماً اپنا گھر علیحدہ کرتی ہے وہ اپنے گھر کا کھانا خود ہی بنتی ہے مرد کھانا عورتوں سے علیحدہ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ صرف دعوت یا کسی تقریب کے موقع پر مرد کھانا بنانے میں ہاتھ بٹاتے



ہیں۔ مرد ایک جگہ پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور عورتیں علیحدہ جگہ اکٹھی ہو کر ایک ساتھ کھانا کھاتی ہیں۔  
ایسے معاشرے میں حکم تو دیرے ہی کا چلتا ہے۔ یہ مہمہ تو اسے ورثے میں ملتا ہے۔ اسی طرح ایک خاندان  
میں باپ یا بڑے بیٹے کا حکم مانا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ان کے شجرے میں کوئی خرابی نہ ہو۔ اگر خرابی نہ ہو تو طاقت  
حاصل کرنے کے لئے آپس میں جھگڑے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر چچاؤں میں یا چچاؤں کے بیٹوں میں  
بعض اوقات یہ خلفشار باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر یہ گروپ ٹوٹنے لگتے ہیں اگر جنگ  
نہ بھی ہو تو اکثر لوگ حلق یا گروپ سے ایک قسم کی علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ معاشرہ کوئی نیا تو نہیں ہے  
جہاں شترک کا یہ طریقہ ہو تو پھر اگر کوئی شترک سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے تو اس کی بھی کوئی موتور ہوتی ہوگی۔  
ہمارے دوست نے وضاحت سے بتایا کہ کسی بھی مری کو حق حاصل ہے کہ اپنے جزوی قبیلے کی زمین چاہے  
چراگاہ یا دیسے ہی پڑی ہو استعمال کر سکتا ہے۔ یہ حق اسے اپنے والد کے توسط سے پہنچتا ہے لیکن جہاں تک  
جانوروں کا تعلق ہے۔ وہ اپنے والد کے جانوروں میں سے اپنا حق لے سکتا ہے اس کا تعین ایسے ہوتا ہے کہ اگر  
ایک باپ کے چار بیٹے ہیں تو وہ جانوروں کے چار حصے کرتا ہے۔ دو حصے وہ اپنے پاس رکھتا ہے اور ایک ایک  
بیٹوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اگر ایک بیٹا اپنا حصہ لے کر باپ سے علیحدہ بھی ہو جائے تب بھی باپ کے مرنے کے بعد  
اسے باپ کے جانوروں میں سے حصہ ملتا ہے۔

اب کافی دیر ہو چکی تھی ہم نے اپنے دوستوں سے اجازت چاہی۔ مری رواج کے مطابق جہاں سے وہ ہیں  
لے کر آئے تھے وہیں چھوڑ گئے۔ یہاں کے معاشرے کا سرسری جائزہ ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیا اب آئندہ  
سطور میں اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ویسے ہم آپ کو بتانا بھول گئے کہ مری دوستوں کی تجویز کردہ مشرک ایک ہفتے میں مکمل کر دی گئی تھی۔







## عمرافے

دنیا کا ہر معاشرہ مخصوص انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ معاشرے کی انفرادی حیثیت، تاریخ، مین، اخلاق اور معاشی قدروں اور دیگر امور پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک معاشرتی نظام کو برقرار رکھنے یا اس کی صورت تبدیل ہونے میں دو قسم کے دباؤ ہمیشہ سے اثر پذیر ہوتے ہیں: ایک مثبت دباؤ ہوتا ہے جسے انگریزی میں "FUSION FORCE" کہتے ہیں۔ یعنی معاشرتی نظام چلبے کیسا بھی ہو مگر کچھ تو امور ایسے ہوتے ہیں جو کہ اس کے برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ باہرے اثرات چلبے کہتے ہیں: دیگر کچھ تو بول ان کو معاشرے میں دخل ہونے سے باز رکھتے ہیں۔ مثبت دباؤ کے امور زیادہ تر نفسیاتی، عمرانی، معاشی اور تاریخی ہوتے ہیں اس کے برعکس منفی دباؤ "FUSION FORCE" ہوتا ہے جو کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت معاشرے میں تبدیلی لانے کا حامل ہوتا ہے۔ نفی سے مراد ہمیشہ کوئی منفی اثر نہیں ہوتا بلکہ یہ نفی کرتا ہے رائج شدہ نظام کی اس طرح مثبت سے مراد ہمیشہ درست اثر بھی نہیں ہے بلکہ یہ رائج شدہ نظام کو برقرار رکھنے کا حامل ہوتا ہے۔ مری معاشرہ پر تو ہم ایک نظر ڈال چکے ہیں اب اس کا تجزیہ کرتے ہیں کہ آخر یہ نظام اب تک کیوں رائج رہا اور کیا یہ نظام آئندہ برقرار رکھے گا؟ اس طرح مثبت اور منفی دباؤ دونوں کا تجزیہ ہو جائے گا پہلے



ثبت دباؤ کی خصوصیات پر نظر دوڑاتے ہیں جو کہ اس معاشرے کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔  
**وہ علاقے کا جغرافیہ** :- یہ علاقہ صدیوں سے الگ تھلک رہا ہے۔ میدان کم پہاڑ زیادہ۔ پانی کی کمی  
 اور نباتات اس قسم کی کہ جانوروں کی افزائش آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ذرائع آمد و رفت محدود، باہر کی دنیا  
 سے تعلق تقریباً غیر موجود۔

**ب: تازہ رخ** :- ایک الگ دنیا ہے جو صدیوں سے چلی آرہی ہے تعلیم کا فقدان، حالات اور جغرافیہ  
 فہم سا تھا۔ عام پیشہ جانور پالنا یا پھر رابڑ والے کے ساتھ زور آزمائی۔

**ج: نفسیاتی عمل** :- جب یہ حالات صدیوں برقرار رہے تو ایک علیحدہ دنیا آباد ہو گئی۔ ذات خاندان اور  
 مال کا بچاؤ تو فطری تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کچھ ہمتی اور یگانگت ضروری تھی تو وہ قائم ہو گئی  
 لیکن صرف اپنے قبیلوں تک تعلیم کی کمی۔ جدید تقاضوں سے نا آشنا۔ ان امور نے آمریت کو جنم دیا۔ آمریت  
 ظالم آمریت تھی جغرافیہ اور تازہ رخ کو دیکھتے ہوئے توقع بھی یہ تھی۔ باہروالوں پر شک اور آپس میں بھی شک  
 شبہ۔ آمر نے اگر کمزوری دکھائی تو نئے آمر نے جنم لیا اور حکم چلایا چاہے آپس میں لڑائی ہو مگر باہروالوں کے سامنے  
 سینہ سپر۔ اسی نفسیاتی عمل کا انگریز نے خوب فائدہ اٹھایا اور رائج شدہ نظام کو فروغ دیا اور ایک نئی  
 بنیاد فراہم کی۔

**د: عمرانی عمل** :- آمریت کو جب فروغ ہوا تو ایک ہی آمر نہیں تھا، تمنداروں اور وڈیروں کی شکل میں بھی  
 آمر ابھرے۔ ادھر آمروں نے اپنے اپنے گروپ اکٹھے کئے، اب عام آدمی کو تو حفاظت پہلے جغرافیائی لحاظ  
 سے آبادی ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ مال مویشی کا پیٹ بھرنے کے لیے گھومنا پھرنا ضروری ہے، گروپ جنرل  
 قبیلوں کی شکل میں گھومتے ہیں۔ انفرادی حفاظت گروپوں کی شکل میں حاصل ہوتی ہے اور گروپوں کی  
 حفاظت قبیلے کی شکل میں۔ گھومنے پھرنے اور جانور چرانے کے دوران آپس کے جھگڑے اور باہروالوں سے  
 جھگڑے تو ہر ایک کا سپاہی ہونا ضروری ہے۔ ایسے ماحول میں انصاف اور اتحاد قائم رکھنا آمری کا کام ہے  
 یہ تقاضے خوش اسلوبی سے بھی طے ہو سکتے ہیں اگر حکومت ہو، تعلیم ہو۔ ذرائع آمد و رفت آسان ہوں۔

**ذرائع معاش** :- اس کا ذکر تو آپ نے پہلے پڑھا۔ زمین اور چرائے کا حق تو ملیں ہیں۔ ماسوائے  
 سردار اور وڈیروں کی زمینوں کے۔ مال چرائے تو پھر اکٹھے ہو کر گروپوں کی شکل میں ہوتی ہے محنت مزدوری کے ذریعے

محدود، سردار قبیلے اور وڈیروں کا اثر ان حالات میں یقیناً زیادہ ہوگا۔

اب منفی دباؤ کے امور کا جائزہ لیتے ہیں جس کا اثر یہاں کے رائج شدہ معاشرے پر مرتبہ بالآخر ہی  
 وائٹمنز کی ملکیت : جیسا آپ نے پہلے پڑھا ہے کہ زمین اور جانور مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ پہلے زمین کی  
 ملکیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ زمین زیادہ تر خیر پڑی ہے۔ آبادی کے ساتھ ساتھ زمین کا تناسب بھی کم ہو گیا ہے  
 اب زمین کو کون ٹھیک کرے اس میں مصدرا تے ہیں کہ اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے  
 کہ ایک منبہ و گروپ مل کر زمین پر قبضہ کر لیتا ہے۔ جب گروپ کی آبادی بڑھتی ہے تو یکم ہستی ٹوٹی شروع ہوتی  
 ہے۔ جانوروں کی مشترکہ ملکیت کا بھی تقریباً یہی عالم ہے جہاں خاندان بڑھا، بھارے شروع ہوئے  
 جب بھارے ہو گئے تو اتحاد پر بھی اثر پڑا۔ اس طرح جب گروپ ٹوٹتے ہیں تو نئے وڈیرے ابھرتے ہیں۔  
 اور اقتدار کے لئے رسد کشتی شروع ہو جاتی ہے۔

ج: ذرائع معاش :۔ ذرائع معاش چونکہ محدود ہیں اس لئے لوگ اکثر اپنے علاقے کو چھوڑ کر دوسری

جگہ منتقل ہو جاتے ہیں یہ منتقلی بھی گروپوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے ہے جو  
 بھی یہاں سے جاتا ہے مشکل ہی سے دوبارہ واپس آتا ہے۔ مگر حال میں اس آبادی کا انحطاط کچھ زیادہ ہی ہو گیا  
 ہے کچھ لوگ پڑھ لکھ بھی گئے ہیں مگر وہ یہاں واپس آنے کے لئے تیار نہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ  
 ان لوگوں کو ٹشکی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پڑھا لکھا آدمی تو جدید تقاضوں کی طرز پر سوچے گا۔ اس سے وڈیرہ  
 کے اپنے اثر و رسوخ پر بڑا اثر پڑتا ہے لہذا ان پڑھے لکھے آدمیوں کا یہاں رہنا مشکل ہے جس طبقے کا ذکر  
 میں کر رہا ہوں۔ ان کا تعلق وڈیروں کے خاندان سے نہیں ہے۔ جب سے ترقیاتی کام شروع ہوئے ہیں گروپوں  
 کی یکجہی میں بھی فرق آیا ہے آج سے دو سال پہلے جو ترقیاتی کام ہوتے تھے تو وڈیروں کو پیسے بانٹ دیئے جاتے  
 تھے اور وہ کام کرانے کی ذمہ داری سنبھالتے تھے کام مشکل سے ہی ہوتا تھا خاندان میں پیسہ بانٹ دیا جاتا  
 تھا مگر اب مزدوری زیادہ تر عام قبائلی کے ہاتھ میں جاتی ہے پہلے لوگ اپنے گروپوں میں ہی رہ کر گزار وقت  
 کرتے تھے مگر اب بے روزگار جہاں کام ہو رہا ہو آ جلتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں لیکن یہ سب کچھ عارضی ہے  
 اصل بات کام کا ملنا ہے ورنہ جب بھی مزدوری ختم ہوئی لوگ اپنے اپنے گروپوں میں واپس ہو جاتے ہیں

لیکن ایک بات ضرور ہے کہ دولت پہلے چند کے ہاتھ میں تھی اب بٹنے لگی ہے یہ تو صرف آغاز ہی ہے۔  
ج: انتظامیہ : آج سے دو سال پہلے تک انتظامیہ پرانے طرز پر تھی جو انگریزوں سے یہاں دہائے میں ملی تھی  
انتظام سردار اور وڈیرے سنبھالتے تھے مگر حکومت کے توسط سے اس کا مطلب یہ ہوا کہ سردار اور وڈیروں  
کی طاقت لا محدود اس نظام کا بنیادی ستون ہی گروپ اور اس کا وڈیرہ تھا۔ یہ نظام کم خرچ تو ہے مگر  
عام آدمی کے لئے سود مند نہیں۔ اس کی وضاحت تو پہلے ہو چکی ہے مگر اب جب نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش  
کی جا رہی ہے۔ تو امریت راہ میں حاصل ہے۔ جہاں ایک مدت سے امریت قائم ہو تو بدلتے بدلتے دیر  
لگے گی۔

م: تعلیم :- تعلیم کو جان بوجھ کر روکا گیا۔ تعلیم سے انسان کی دماغی وسعت بڑھتی ہے اس کے سامنے  
چھوٹے گروپوں کی محدود دنیا نہیں ہوتی۔ پڑھا لکھا آدمی امریت کو کبھی قبول نہیں کرتا اور وہ بھی  
وڈیروں کی امریت۔

ن: ذرائع آمد و رفت :- انسان تعلیم صرف کتابوں یا اسکوٹوں سے ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ سفر اور دوروں  
سے مل کر بھی کافی کچھ سیکھتا ہے اب جبکہ ذرائع آمد و رفت قائم ہوئے ہیں تو لوگوں کی نفی اور دماغی وسعت  
میں بھی فرق پڑا ہے ہر ایک باہر والا کافر اور ظالم ہی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ بہتر انسان ہو میل ملاپ سے  
بھی انسان کی پہچان ہوتی ہے اور باہمی ربط قائم ہوتا ہے میری معاشرہ کے بارے میں ذاتی تجزیہ آپ کے  
سلسلے ہے اگر نظام کو بدلتا ہے تو ان تقاضوں کو مد نظر رکھنا ہو گا تاہم یہ حقیقت ہے کہ صدیوں کی امریت  
بدلتے بدلتے بھی اپنا وقت لے گی۔







بغیر وزن کو چسما گاہ میں چسما رہے ہیں



## صنفِ نازک سے سلوک

مری معاشرے کی ایک ہلکی سی تصویر آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ یہ نہیں کہاں تک ہم اس میں کامیاب ہوئے۔ اب ذرا وضاحت سے کچھ اہم نقوش کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ایک مری دوست ہیں جو ہمیں بہت ہی عزیز ہیں وہ مانے ہوئے خاندانی دذیرے ہیں ذاتی دوستی کی وجہ ان کا رتبہ نہیں بلکہ ان کی کچھ اپنی خوبیاں ہیں مثلاً انہیں نجی فائدے کی نسبت عوام کی بھلائی زیادہ عزیز ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے لوگوں کی بات کرتے ہیں۔ اپنے ذات کو پس پردہ ہی رہنے دیتے ہیں۔ ہر ایک شخص میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہمارے دوست میں بھی ہیں۔ وہ اپنی کسی کمزوری کو خامی نہیں سمجھتے بلکہ اپنے رواج کے سر تعویذ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر ہم ایسا کریں تو ہمیں وڈیرہ کون سمجھے اور عزت کیسے ہو۔ ہمارے باپ دادا نے اس سے زیادہ کیا تھا اور یہ تو ہماری عزت کا معیار ہے۔ رواج تو بہر حال ہیں قائم رکھنا ہے۔ یہ تو آپ کل ذاتی معاملہ ہے مگر ہم اس کی تائید نہیں کرتے مگر آپ کون تائید یا نا تائید کرنے والے ہمارے دوست کی چار بیویاں اور کچھ باندیاں ہیں۔ چار بیویاں تو چلے شرع کی رو سے جائز ہوئیں مگر یہ باندیاں کیسی دراصل یہاں پر عورت کی کچھ زیادہ وقعت نہیں اور نہ بھی کیسے جتنا غیر ترقی یافتہ علاقہ۔ اتنی ہی

بے چاری منہ نازک مظلوم۔ جب ہمارے بڑے شہروں میں جہاں تعلیم بھی ہے اور دوسری سہولتیں بھی مہیا ہیں۔ عورتوں کو اب بھی پورے حقوق حاصل نہیں تو صاحب یہ علاقہ تو اب بھی پندرہویں صدی میں ہے۔

ایک سچا واقعہ بھی اس سلسلے میں سن لیں۔ یہ واقعہ شاید ۱۹۶۴ء کا ہے جبکہ حکومت کے خلاف تیار ہونے والے نوروں پر نہیں۔ ایک آپ اسٹارٹ "قسم کے وڈیرے ان کارروائیوں میں پیش پیش تھے۔ یہ خاندانی وڈیرے تو نہیں تھے مگر زور دکھایا اور زبردستی اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ یہ تو ہونا تھا کیونکہ زور انہیں کا تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے اب نگرے وڈیروں سے نگرلی اور انہیں نیچا دکھایا اور کیا زیر انہوں نے ہمارے دوست پر بھی ہاتھ ڈالا۔ ہوا یہ کہ کچھ حالی موالی اکٹھا کئے اور ایک سرغنہ کو پیسے دے کر کچھ بھیریں زبردستی اٹھوائیں۔ اگر ایک وڈیرے کی بھیریں اس طرح چلی جائیں تو اس کی عزت تم۔ دنیا طعنہ دیتی ہے۔ ہمارے دوست نے بھی دوسرے یون سرغنہ کی بیوی اٹھوائی اور کر لیا اسے حرم میں داخل اور پھر اپنے حریف کو پیغام بھیجا کہ اپنے باپ کی اولاد ہو تو لے جاؤ عورت کو واپس۔ اس واقعہ کو دس سال ہونے کو آئے۔ سرغنہ اب تک سر پیٹا ہے کہ دوادو میری بیوی مگر کون دلوئے۔ ہمت ہے تو لے جاؤ۔ یہی ہاں کا قانون ہے۔ جانے دیجئے اس قفسے کو بس بات سے بات نکل آئی۔ ہاں اس نکتے میں ایک باریکی ہے وہ یہ کہ یہاں سب کی منفقہ رائے یہ ہے کہ اس طرح ایک عورت کو باندی بنانا جائز ہے۔ باندی بھی جنگوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ویسے یہ ہماری رائے نہیں ہے۔ اس پر تو اہل علم ہی بحث کر سکتے ہیں۔

ان شادیوں، باندیوں پر کیا اعتراض کیا جاسکتا ہے مگر ایک بات ضرور ہے کہ ایک طرف تو یہ بنات اور دوسری طرف جوان آدمی شادی کو ترستے ہیں۔ اچھی خامی ہمارے لوگ کنوارے پھرتے ہیں اور اس فکر میں کوشاں کہ پیسوں کے بغیر کس طرح شادی کریں۔ آج کل تو کم سے کم بھی نسب کی رقم چھ ہزار سات ہزار سے "لب" ایک قسم کا حق مہر ہے جو کہ شادی کے وقت لڑکی کے والدین کو ادا کیا جاتا ہے۔ بیچاری عورت سارا ہی کام کرتی ہے۔ بچوں کو پالتی ہے گھر کو سنبھالتی ہے جس میں کھانا پکانا وغیرہ سب ہی شامل ہے جانوروں کی دیکھ بھال بھی اسی کے سپرد پیارٹیوں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتی ہیں پورے گھر کے لئے میلوں سے پانی بھی

لاتی ہیں اگر مرد کھیتی باڑی کرتا ہو تو اس کی دیکھ بھال بھی اسی کا ذمہ۔ بھائی سارا کام جب عورت کرتی ہے تو مرد۔ مرد کا کام صرف عورت کی حفاظت، لڑائی جھگڑوں میں حصہ لینا۔ ہمارے ایک دوست کہنے لگے کہ ایک طرح سے آپ دیکھیں تو ایک عورت سکام نہیں چلتا۔ ایک تو چاہیے صرف مرد کے اپنے لئے اور باقی کے لئے کام اتنے ہیں کہ انہیں ویسے ہی فرصت نہیں ملتی۔ جیسے جیسے مال بڑھتا جاتا ہے اس کی دیکھ بھال کے لئے بھی زیادہ لوگ چاہیں۔ کام میں ترقی ہوئی تو دیکھ بھال کے عملے کو بھی بڑھایا۔ یہی ایک سبب ہے کہ یہاں کم عمری میں شادیاں نہیں ہوتیں۔

یہاں دو رواج عام ہیں آپ بھی سن لیں۔ پہلا رواج تو یہ ہے کہ عورت چاہے کتنی ہی عمر کی کیوں نہ ہو بے شک اس کی اپنی اولاد بھی ہو اپنے خاوند کے انتقال کے بعد میکے واپس آ جاتی ہے مگر وہ شادی کے قابل ہو تو پھر لب لے کر اس کی شادی کی جاتی ہے، دوسرا رواج بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے وہ یہ کہ جب لڑکی کی شادی کی جاتی ہے تو آٹھ تھپٹے کر لیا جاتا ہے، لڑکی کے بطن سے جو پہلی لڑکی ہوگی وہ ماما کی ملکیت لہذا ماما صاحب اس نواسی کو واپس لیتے ہیں اور پھر لب "ان کا حصہ۔"

یہ فرسودہ رواج ابھی تک کیوں رائج ہیں۔ تعلیم کی کمی پھر معاشی اور سماجی پسماندگی اس کی ایک اور وجہ بھی ہے جس کا تعلق عالم معاشیات سے ہے آپ کو تعجب تو ضرور ہو گا۔ وہی پلائی اور ڈیمانڈ کی ہیرا پھری جس نے دنیا کو بلا دیا ہے۔ ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے تحت بالغ مری مردوں کی تعداد ۶۴۸ تھی جبکہ عورتیں صرف ۳۷۰ تھیں یعنی ۱۴۱ کا خسارہ۔ یہ خسارہ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب کھاتے پیتے گھرانے کی چار چار بیویاں اور حرم بھی۔

عورت کی شادی کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ مرد ہم لپہ قبیلے سے ہو۔ مرد کو آزادی ہے جہاں شادی کرے۔ مرد کے لئے تو خیر آزادی ہی آزادی ہے۔ غریب عورت ہی ہے جس پر سارے قسم لٹتے ہیں وڈیرے لوگ عموماً ایک شادی قریب کے چٹان قبیلوں میں کرتے ہیں۔ شاید ان کا تعلق حسن سے ہو کیونکہ یہ عورتیں نسبتاً خوبصورت ہوتی ہیں۔ آخر کو یہ لوگ بچے گھر بنا کر رہتے ہیں۔ گھومتے پھرتے کم ہی ہیں۔ ہم نے کسی مری عورت کی شادی غیر قبیلے میں نہیں سنی اس بارے میں رواج شاید معاشیات یا معیار کا دخل ہو۔



غریب عورت کا وراثت میں بھی کوئی حصہ نہیں ہوتا لیکن عجیب بات ہے کہ جب انگریز کی حکومت تھی تو اس نے یہ قانون ضرور پاس کیا تھا کہ اسلامی قانون مجنسم یہاں پر بھی نافذ ہونے چاہیں۔ قانون تو نافذ ہو گیا مگر صرف کاغذ پر اب اسے عمل میں کون لائے یہ ہمیں انگریز کے گزیٹیر میں ایک مقدمے کا قصہ پڑھ کر معلوم ہوا۔

ہمارے ایک مری دوست ہیں جو کافی صاحب حیثیت ہیں کسی زمانے میں مانے ہوئے فراری تھے ہمیں پتہ چلا کہ ان کی بہن کا انتقال ہو گیا۔ ازراہ ہمدردی ان سے افسوس ظاہر کیا۔ بڑی زور سے منس کر لوئے "ارے صاحب جانے دو عورت کے انتقال پر افسوس۔ ہمارے ہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے بس جیسے جانور مر گیا۔ وہ ہی بات ہے" ہم تو اظہار ہمدردی کر رہے تھے ہمیں بید غمہ آیا کہ بہن کا یہ احترام مگر ان رواجوں کا کیا کیجئے؟۔

ان ساری باتوں کے باوجود عورت کو یہاں کی غیریت کے معائنے میں بڑا دخل ہے عورت چاہے کسی بھی قبیلے کی ہو وہ سب کی عزت ہوتی ہے۔ زیادہ تر بڑا بیاں اور جھگڑے عورت کی عزت سے ہی تعلق رکھتے ہیں کسی کی عزت کو خاک میں ملانا ہونب بھی اس بے چاری کو نشانہ بنایا جاتا ہے میرے خیال میں اس ضمن میں خود داری کو زیادہ دخل ہے۔ مرد تو پھر مرد ہوا۔ عورت کی حفاظت اس کا اولین فرض ذرہ غیرت کو دھچکا لگتا ہے غیرت آسانی سے نہیں گنوائی جاسکتی۔ اگر غیرت نہ ہو تو یہاں رہنا محال۔ پھر صنف نازک پر بھی رعب رکھتا ہے۔ رعب کی حالت میں برقرار رہتا ہے کہ ہر طرح سے اسے دبا کر رکھا جائے۔ نفسیاتی بھی اور معاشی بھی ہم اپنے ایک دوست سے ملنے گئے وہ اس وقت ایک چراگاہ میں مقیم تھے یہاں کے دامن پر جھگیاں نصب تھیں ماشاء اللہ ان کی تین بیویاں تھیں۔ ہر ایک کی جھگی علیحدہ علیحدہ ان کی ذمہ داری کا مال بھی علیحدہ۔ مال سے مراد بھڑی بکریاں ہیں۔ ہمارے دوست ہمیں دور سے دیکھ کر بڑے شاہانہ انداز میں ہماری طرف سے معمولاً جب وہ ہم سے ملنے آتے تھے تو بڑی انکساری سے کام لیتے تھے ان کے چلنے اور ملنے کا انداز بھی جدا ہوتا تھا مگر آج آہستہ آہستہ جھگیوں پر نظر مارتے ہوئے آگے آگے "ان کا کمربند نیچے زمین تک رکھا ہوا۔ ہم سمجھے کہ یہ نادانستہ بات ہوگی۔ قریب آگے تو گلبے ملے۔ ہمیں جلدی تھی اس لئے انہیں جیپ میں ٹھالیا

کہ آرام سے بات ہو جائے گی پہلے تو ہم نے انہیں مذاقاً ٹوکا کہ جناب آپ کا کمربند لٹکا ہوا ہے کہیں پیر کے نیچے آگیا تو آپ گر جائیں گے۔ بڑے زور سے ہنسنے لگے۔ نہیں صاحب یہ تو ہماری مردانگی کی نشانی ہے اگر ہم اس طرح اپنی عورتوں کے سامنے سے نہ گزریں تو وہ برا مانتی ہیں کہ پتہ نہیں کیا بات ہے کآج وڈیرہ ڈھیلہ ہے۔ ان کا اس طرح چلنا بھی اپنی عورتوں کے روبرو بالکل جائز۔

ایک دفعہ ہم کھانے پر گئے ہمارے ساتھ اور مری دوست بھی تھے۔ کھانے پر عموماً سچی ہوتی ہے سبھی کی خوبیاں اور طریقے ہم نے بیان کر دیے۔ یاد دہانی کے لیے بھڑکے نیچے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کر لئے جاتے ہیں اور اسے چاروں طرف آگ جلا کر مدھسٹ کر لیا جاتا ہے۔ جب سبھی آئی تو اس میں پسلیاں بھی تھیں، آپ کو تو معلوم ہے کہ پسلیوں میں گوشت برائے نام ہی ہوتا ہے۔ سارے مری دوست قہقہہ لگا کر ہنسنے اور میزبان سے یک زبان ہو کر بولنے لگے "اے ہم کو کئی عورت ہیں یہ عورت کا حصہ یہاں کیوں بھیجا ہے۔" ہمارے میزبان بہت ہی جھینپے دراصل یہ سخت غلطی ہو گئی تھی۔ البتہ کہ عورت کا حصہ کھانے میں بھی کم ہی ہوتا ہے۔ منی پسلیاں۔

ایک عجیب بات ہے گو غریب لڑکیوں کو بھی بھاری قیمت یا تلب پر گھر سے رخصت کیا جاتا ہے مگر پھر بھی لڑکی کی پیدائش پر کچھ خوشی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ افسوس کیا جاتا ہے۔ عام آدمی کو تو خوشی ہوتی ہوگی کیونکہ بہت سول سے ہم نے اس بارے میں استفسار کیا۔ ان کے کچھ ملے جلے تاثرات تھے "اللہ کی دین ہے مالی لحاظ سے فائدہ ضرور ہوتا ہے مگر ان کی حفاظت بڑی ذمہ داری ہوتی" ہاں کھاتے پیتے لوگ تو لڑکیوں کی پیدائش پر ضرور غمگین ہوتے ہیں۔ بلکہ ماں بے چاری پر ایک قسم کا طنز بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز دوست ہیں ہفتے میں ایک بار ضرور ملنے آتے ہیں حالانکہ ان کا گھر کوھلو سے بیس میل دور واقع ہے عمر تقریباً ستر سال ہے۔ چھوٹا قد لمبی دائمی بڑی بڑی مونچھیں، بالوں پر خضاب لگاتے ہیں۔ ان کا قبیلہ کافی لڑاکا مشہور ہے انہوں نے ہمیں تنگ بھی کیا تھا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ بہادر ہی بہادر ہیں۔ عقل شاید حصے میں نہیں ملی مگر خلوص بے پناہ اور بات بالکل سیدھی کرتے ہیں۔ چار شاخیاں کیں تھیں۔ دو کا انتقال ہو گیا۔ دو ہفتے ملنے نہ آئے تو ہمیں بھی فکر ہوئی کسی سے کہلو ابھی کہ خدا نخواستہ طبیعت نا ساز ہے حقیقت بعد میں پتہ چلی کہ ان

کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے تو سوگ منار ہے تمہارے میری پر لعن ملعن کہ ہم اتنی تیاری کر رہے تھے کہ لڑکا پیدا ہوگا تو مہمان بلائیں گے اور اچھا سا نام تجویز کرائیں گے اب میں کیا لوگوں کو منہ دکھاؤں گا۔

سوگ بھی خوب ہے ہمارا ذاتی خیال ہے کہ لڑکیاں تو نعمت ہوتی ہیں۔ جتنی محبت اپنے ماں باپ سے نہیں ہوتی ہے لڑکوں کو شاید ہی ہوتی ہو۔ یہ تو ہمارا اپنا ذاتی تجربہ ہے۔ وڈیرے صاحب غیر معمولی تائیر کے بعد تشریف لائے کہ صاحب ہمارا دوستادی اور کرنے کا ارادہ ہے۔ قوم کہتی ہے کہ وڈیرہ بغیر چارپا دیوں کے چلتا نہیں۔ دو تو مر گئیں ان کی کمی پوری کر رہی ہے۔

”بس رہنے دو شادیوں کو تمہارے بچے دیے ہی کافی بڑے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن رواج کا کیا کریں۔ ہم آج کل بیمار بھی ہیں۔ ذرا ڈاکٹر کو ملنا بھی ہے۔“

”ڈاکٹر کو چلے ہم دکھا دیتے ہیں مگر شادیوں کی کیا مصیبت ہے۔ بار بار پیسہ ضائع کرتے ہیں۔“ پیسے کی

کیا بات ہے ہمارے پاس سسٹر اونٹ ہیں دو بچیں گے اور اچھی سے اچھی عورت ملے گی۔ آپ ہمارے ساتھ جانے کی تکلیف نہ کریں۔ ہم خود ڈاکٹر صاحب کو دکھادیں گے آپ بس ٹیلیفون کر دیں۔

وڈیرہ تو ڈاکٹر کو دکھا کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے ہم نے انہیں تحبیس سے پوچھا کہ ہمارے دوست کوئی زیادہ بیمار تو نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے یہی ہے کہ قابو میں نہیں آتی۔ تھوڑی دیر بعد ہنس پر قابو پاتے ہوئے بولے ”بیماری تو کوئی نہیں شادی کی تیاریاں ہیں اب یہ عمر شادی کی ہے۔“

ایک روز کام سے اکتا کر ہم نے سوچا کہ شکار کا پروگرام بنایا جائے۔ انوار کا دن تھا اور موسم بھی خوشگوار۔ بندوق اٹھائی اور چل دیے ہم کوئی خاص شکاری تو نہیں ہیں مگر کیا کریں کچھ تو تبدیلی ہونی چاہیے۔ جیب سڑک پر چھوڑی اور پہاڑوں کا راستہ کیا۔ چلتے چلتے ہمارے ایک جاننے والے مل گئے۔ مع اپنے خاندان اور مال کے نئی چراگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ کھڑے ہو کر باتیں ہونے لگیں اور مقرر کہ ہم آپ کو شکار کھلائیں گے۔ منع کیا مگر بعد ساتھ کوئی ہونا چاہیے۔ چلیے آپ کی خوشی۔ شکار کھیلے رہے تیرے بغیر کتے کے کب ہاتھ آتے ہیں ایک جگہ سے اڑتے اور پھر غائب ان کا پیچھا کیا۔ اگلے پہاڑ سے اڑے اور پھر اوجھل



جب کافی مرہ گزر گیا تو میں پیاس لگی تو دوست نے تجویز کیا کہ مدھران کا خاندان گیا ہے اور چلتے ہیں۔ خاندان اور جانور تو نظروں سے دور ہو چکے تھے۔ اب ہمارے ساتھی سمت رکھ کر چلے دیے۔ تھوڑی تھوڑی دور پر "پیش" یا "مرزی" کے تازہ ٹوٹے ہوئے پتے ملے اور ان پر ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا۔ ہم نے پوچھا کہ یہ پتے اور پتھر کیسے؟ جب ہمارا خاندان ایک جگہ سے منتقل ہوتا ہے اور آدمی پیچھے رہ جائیں تو ہوتی ہی سب کام سنبھالتی ہیں۔ مرد تو خیر ہمیشہ ہی پیچھے رہ جاتے ہیں اگر عورتیں جگہ ٹھیک کر لیں اور جھگیاں لگا دیں۔ مرد تو آرام کرنے کے لئے بعد میں آجاتے ہیں۔ یہ پتے اور پتھر ہماری بیویاں رکھتی جاتی ہیں تاکہ ہمیشہ راستے کا پتہ چلتا رہے۔ کیا ٹھٹھ ہیں۔ جب سب کام ہو جائیں تو مرد آرام کے لیے موجود یہ ہوئی خدمت۔

ہم لوگ چلتے رہے نشان دیکھ دیکھ کر ایک جگہ ہمارے دوست کو زمین پر ایک گول پکڑ کا تازہ نشان نظر آیا اور اس نشان کے ایک سمت میں سیدھی لکیر کھینچی ہوئی تھی اب انہوں نے لکیر کی سمت چلنا شروع کیا تھوڑی دور چل کر ہم ایک چشمہ پر پہنچ گئے۔

جب ہم پانی پی چکے تو ان سے پوچھا کہ جو نشان آپ نے راستے میں دیکھا تھا اس سے مراد کیا ہے؟ یہ نشان ہماری بیویاں اس وقت بناتی ہیں جب وہ پانی کی تلاش میں مرنے لگی ہیں پتہ رہے کہ وہ کہاں ہیں۔ ہمیں کافی دیر ہو گئی تھی۔ اپنے دوست سے اجازت چاہی۔ وہ ہمارے ساتھ واپس چلنے لگے لاکھ منع کرنے پر کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ نہیں یہ ہمارا رواج ہے کہ جہاں سے ہم اپنے مہمان کو لے جاتے ہیں وہیں چھوڑ کر آتے ہیں پچھلے آپ کی مرنی۔

ایک ہمارا اپنا مشاہدہ ہے اس کی وجہ لوگوں سے پوچھنے کی کوشش کی مگر کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا جب حالات ذرا خراب تھے ہم نے اکثر دیکھا کہ مردوں کو پوچھ گچھ کے بلایا جاتا تو بیویوں پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا وہ اپنے آرام سے کام کاج میں مصروف رہتی لیکن اگر کسی کی اولاد کو بلوایا جاتا ہے بیٹے کی عمر بچپن یا چھ برس کی کیوں نہ ہو۔ ماں تڑپ اٹھتی ساتھ ساتھ چل کر آتی کہ میرا بیٹا ہے گناہ ہے یہی میرا ایک بہار ہے اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی وغیرہ وغیرہ ماں تو ماں ہوئی مگر بیوی کا شوہر کے بارے میں غمزدہ ہونا۔ تیر عمر نہ سنا۔ کچھ غمزدہ در ہوتا ہو گا۔ چلے بہ تو وہ زمانہ تھا جبکہ حالات ٹھیک نہ تھے مگر یہی



حال بہنے اپنے اسپتال میں دیکھا۔ بیٹے کی عمر چارہ کچھ سبھی ہو مگر ماں بقرار ہم نے اپنے دوستوں سے رجوع کیا۔ کہنے لگے کیا باتیں۔ انہیں کام سے ہی فرصت نہیں ہوتی پھر سیاں جب شاویاں طے ہوتی ہیں تو عشق کا عنصر تو ہوتا ہی نہیں اگر ایسا ہو تو گولی نہ چل جائے میرے خیال میں تھوڑا بہت اس معاملے میں غیرت کو بھی دخل نہ

منفِ نازک کو جس روپ میں دیکھے اس کا اپنا جدارنگ ہے 'مرو اس کی عزت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ماں 'بہن' بیوی' اں بیوی کے بارے میں کچھ اختلاف رائے ہو سکتے ہیں مگر دررشتے تو اپنی جگہ قائم ہیں 'ماں تو پھر ماں ہے' اس کا نعم البدل کہاں۔ ماں کا بھی تو منفِ نازک سے تعلق ہے 'ہسپتال میں ایک عورت اپنے جوان بیٹے کو ساتھ لائیں۔ بیٹا اٹھنے بیٹھنے سے معذور۔ پتہ نہیں کب سے بیمار تھا۔ غریب فی۔ بی۔ زیبا۔ سیٹس 'خون کی کمی اور معلوم نہیں کیا کیا بیماریاں لاحق تھیں۔ ڈاکٹر مجھے معلوم ہے یہ مشکل سے نچے گا۔ یہ میرا اکلوتا بچہ ہے کچھ تو کرو۔

تقدیر کے آگے کسی کا بس نہیں۔ موت سے دو دن پہلے ماں کو آگاہ کیا کہ اب اسے اگر لجانا چاہی ہو تو لیباؤ مجھے معلوم ہے لیکن تھوڑی اور کوشش کر لو۔ اب کہاں لیجاؤں۔ یہاں تو آرام سے رہے گا۔ اس نے بڑی مہینتیں اٹھائی ہیں 'بیماری کے دوران پی سے لگی بیٹھی رہی۔ کفن دفن کا بندو بست کیا گیا ماں سے پوچھا کہ اگر کوئی رشتہ دار ہو تو بتاؤ اسے بلوائیں "کون رشتہ دار ہے" اپنا جو تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

جب تک قبر تیار ہوتی رہی میت سے چپٹی بیٹھی رہی ساتھ میں ایک پوٹلی اٹھائی ہوئی تھی اس کو بڑا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ دفن سے فارغ ہو کر ماں سے انہار ہمدردی کیا۔ پوٹلی کھول کر سامنے رکھی۔ اس میں کچھ مٹھائی اور چھپواری تھے کہ یہ لوگوں میں بانٹ دو۔ غریب کہاں سے لائی ہوگی 'یہ ہمارا دستو ہے' غریب بہت ہی صابر تھی شام کو ٹہلنے نکلا۔ تب بھی قبر سے چپٹی ہوئی تھی اس کی محبت کو کون سمجھے۔ ماں کا دل تو صرف ماں کے ہی پاس ہوتا ہے۔ کہاں سے بہت آئے کہ ماں کو سمجھا یا جائے کہ ایسا نہ کر، اس سے کیا فائدہ 'ماں کے نزدیک تو نفع نقصان کی کوئی اہمیت نہیں ماما کے آگے عقل اور دل کی پیچ۔ جہاں ایسی مائیں ہوں وہاں منفِ نازک کی عزت میں کوتاہی۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے بس رواج ہے۔

اب ذرا تصویر کا ایک اور رخ بھی دیکھ لیتے ہیں مری دوست جو سڑک پر کام کرتے تھے ہیں ہم پر

بڑے مہربان ہیں۔ جب موڈ میں ہوں تو بڑے مزے لے کر قہقہے سناتے ہیں۔ لڑائیوں کے۔ اپنے رواجوں کے۔ اپنی دوستی۔ دشمنی کے زیادہ تر غریب کنوارے ہیں۔ دھن یہ کہ جلدی سے چھ سات ہزار روپیہ اکٹھا ہو تو شادی کریں۔ یہ بتاؤ کہ اب تک آپ لوگ بغیر شادی کے کیسے رہتے ہیں۔ یہ سوال ہم نے اس لیے کیا کہ دنیا کے ماہرین نفسیات کی رائے یہ ہے کہ جنس بھی ایک طرح کی ضرورت ہے۔ جیسے بھوک۔ پیاس وغیرہ۔ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ انسان اتنی عمر بغیر شادی کے پہنچ جائے۔ ایک دو نہیں بلکہ آبادی کی بیشتر تعداد۔ پہلے ہنسے پھر کچھ شرطے ایک نے شرارتا کہا۔ شیشہ مار کر۔ یہ اصطلاح ہماری بھو میں بالکل نئی آئی۔ آپس میں کھسکے شروع ہو گئی۔ ہر ایک ہنستا ہے اور ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس سے پوچھیں۔ آخر ایک نے ہمت کر لی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج سے پہلے ہمارے دو ہی کام رہے ہیں۔ جانور جہان یا لڑائی لڑنا۔ بیشتر وقت جانور جہان میں گزرتا ہے۔ جانور تو ہم چھوڑ دیتے ہیں اور اونچی جگہ پر بیٹھ کر ان کی بھگبانی کی جاتی ہے اب بیٹھے بیٹھے کیا کریں۔ ہمارے پاس تو عورت ہے نہیں۔ وروں کے پاس ایک کی بجائے چار اور پھر باندیاں بھی یہ لوگ بھی کام کو نکلتے ہیں۔ پانی بھرنے لکڑی کاٹنے جانور چرانے۔

مگر اس میں شیشہ کی بات کہاں آئی۔

آئے گی آپ کو تو معلوم ہے ہمارے سب کے پاس شیشہ ہوتا ہے۔ آپس میں شیشہ مارنے کے لیے اور جنگ میں۔ یہ ہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جنگ کی اور بات ہے۔ امن میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ شیشے کو چھلی کے نیچے میں رکھتا ہے تاکہ شیشے کی چمک دیکھیں۔ ہمارے بلکہ اس کی نوک سے بغیر پھیلے ہوئے نکلے۔ جب اپنی پسند کو دیکھتے ہیں تو شیشہ مار کر چمک اس کے منہ پر ڈال جاتی ہے۔ اس طرح یہ چمک کس اور کو نظر نہیں آتی۔

لیکن آپ لوگوں کے یہاں تو اس بات پر گول ماری جاتی ہے۔ پھر بھی یہ حرکتیں ہوتی ہیں۔ گولی تو بالکل ٹھیک ہے مگر شعرے کے بغیر زندگی کا مزہ کیا۔ گولی تو اس وقت لگتی ہے جب کام بے وقوفی سے کیا جائے اب آپ بتائیں کہ زندگی کس طرح گزرے۔ دن رات جانوروں کو دیکھتے ہیں۔ انسان کیسے مہر کرے۔



تیرک در دلتا در سبقت







کریک سٹوڈیو کی فوٹو گرافی کے لئے ہے

## آدم اور حوا

ہم نے اکثر پڑھا اور اپنے دوستوں سے بھی سنا کہ یہاں سیاہ کاری کی سزا موت ہے۔ تاہم یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ کم تر ذات کے ساتھ یہ حرکت معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ جہاں ہر چیز کے بارے میں رواج ہیں وہیں اس حرکت کے بارے میں بھی رواج ہوگا۔

پہلی بات تو یہ کہ دونوں مجرموں کو موقع یہ ہی ختم کر دیا جاتا ہے مگر موقع پر ختم کرنے کا حق ہر ایک کو نہیں۔ یہ سزا صرف سسرال اور میکے والے دے سکتے ہیں۔ سسرال میں نہ یہ فرد ذمہ دار ہیں۔ خاوند خیر اس کا حق ہونا تو لازمی ہے آخر عورت کی ملکیت ہوئی۔ خاوند کا بھائی۔ خاوند کا والد یعنی سسرال اور خاوند کا بیٹا چاہے کسی ماں سے ہو۔ اب میکے والوں کو لے لیجئے۔ ادھر صرف باپ اور بھائی کو اختیار ہے کہ یہ سزا دے سکیں ایک دفعہ جب عورت کی شادی ہو جاتی ہے تو میکے والوں کا کوئی حق نہیں رہتا۔ مرد ہر لحاظ سے اس کا ذمہ دار اور عورت جو بھی حرکت کرے اس کا جواب دہ۔ مثال کے طور پر اگر عورت کوئی خون کر دیتی ہے یا کسی اور غلطی کی ترکیب ہو تو خاوند کا یہ فرض ہوتا ہے کہ معاملے کو خوش سلوپی سے رواج کے تحت طے کرے۔ جب اتنی بڑی ذمہ داری خاوند سنبھالتا ہے تو مرد کے احکام بھی نادر شاہی ہوتے ہیں۔ سسرال والوں سے اگر تعلقات استوار نہ ہوتے تو

ملنے کی اجازت بھی نہیں۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ بھائی کو خبر ملی کہ بہن سخت بیمار ہے۔ بھائی آیا بھی تو دور بیٹھا ملنے کے لئے خوش آمد کرتا رہا۔ اجازت نہ ملتی تھی نہ ملی۔ اگر خاوند کو رحم آگیا تو مرنے کے بعد شکل دکھادی۔ ورنہ اس کا بھی امکان اکثر کم ہی ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ہم اپنے مری دوست سے ملنے گئے وہ اپنے قبیلے کے کہنی ٹکڑے وڈیرے میں ایک پیر کے سائے میں بیٹھے ہوئے اور مفلح جی ہوئی جیسے مقدمے کر رہے ہوں۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کر ہمارے پاس چلے گئے ہم نے لاکھ کہا آپ اپنا کام کریں مگر بقدر تھوڑی دیر تو بیٹھیں۔ چلے بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر یہ کچھ پر کیسی گائی ہوئی ہے۔ میاں بیوی کا آپس کا جھگڑا ہے۔ مرد عورت کو چھوڑنا چاہتا ہے اسے کرنا ہے۔  
”میاں بیوی کے جھگڑے بھی آپ کے پاس آتے ہیں۔“

”ہاں آجاتے ہیں مگر یہ؟“ ہوتا ہے کسی زمانے میں یہ کام سردار کا ہوتا تھا مگر ہم اپنے مقدمے کیوں سردار کے پاس لے جاتیں۔ اول تو کوڑے کون بائے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اپنی قوم کو سنبھالیں اگر اپنے قبیلے کے مقدمے باہر جائیں تو ہمارا اپنا اثر کم ہو جاتا ہے۔

بات بھی درست۔ اپنا زور کون کم کرتا ہے اس زور کو تو اور بڑھا چلے لیکن ہمارے دوست یہ کام نہ کریں تو غریب آدمی کہاں جائے۔ ہم نے مقدمے کے بارے میں پوچھا۔  
”آپ کے ہاں طلاق بھی ہو جاتی ہے؟“

طلاق صرف مرد کی مرضی پر ہے۔ خلع کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس جھگڑے میں اب مرد کو یہ بتانا ہو گا کہ وہ کیوں عورت کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ اگر اس کی وجوہات درست ہوں تو ٹھیک ہے اس میں عورت اپنے سسرال چل جائے گی اور اس کے وارث نب کی رقم واپس کر دیں گے۔

”فرض کیجئے خاوند اپنی بیوی کو چھوڑنے کے بارے میں کوئی قابل قبول وجوہ بیان کرنے سے قاصر رہا تب؟“  
”اگر ایسا ہوا تو خاوند کو جبرانہ ادا کرنا ہو گا۔ لیکن طلاق ہو جائے گی۔ تب کی رقم وراثتوں سے لینے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔“

”یہ جملے کی رقم کس کے پاس جائے گی اور اگر فرض کیجئے خاوند جبرانے کی رقم دینے سے انکار کر دے۔“

”جرمانے کی رقم تو ہمارا حصہ ہے۔ رقم نہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس دن ایسا ہوگا تو ہمیں کون پوچھے گا۔ جب تک ہم میں طاقت ہے کسی کی کیا مجال کہ ہمارا ہمانہ مانے۔“

”فرض کیجئے کوئی عورت تنگ آکر یا ویسے ہی اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی جائے۔“

اگر ایسا معاملہ ہو جائے تو خاوند شکایت ہمارے پاس لاتا ہے پہلے یہ کام سردار کے سپرد تھا ہم اس وقت کو بلاتے ہیں اور طلاق مکمل کراتے ہیں۔ پھر اس عورت کا نکاح کسی اور سے کر دیتے ہیں۔ دوسرے خاوند جو لب کی رقم حاصل ہوتی ہے وہ پہلے خاوند کو دی جاتی ہے۔ یہ لب کی رقم عموماً پہلی لب کی رقم سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس میں سے کچھ حصہ ہمارا ہوتا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد چائے آگئی چائے تو پیانا ضروری تھا۔ ورنہ ہمارے دوست ناراض ہو جاتے وقت بھی تھا ہم نے سوچا اس موضوع پر مزید معلومات حاصل کر لی جائیں۔ وہاں کچھ اور مری دوست بھی اکٹھے ہو چکے تھے اور سلسلہ کلام جاری تھا۔

”اچھا یہ بتائیں کہ ہمیشہ سیاح کار کو مار دیا جاتا ہے یا کوئی فیصلہ بغیر مارے بھی ہو سکتا ہے؟ ہم نے یہ سوال اس لئے کیا تھا کیونکہ اس جرم کے مرتکب اکثر تنگے لوگ بھی ہوتے ہوں گے اور غریب خاوند کی بہت نہ پڑے وغیرہ وغیرہ۔“

ہمارے دوست نے چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور تو قفس سے بولے۔ اگر سیاح کاروں کو نہ مارا جائے تو جس خاوند یا مجرم کے ساتھ نیادتی ہوئی ہو تو وہ سب کے سامنے یہ الزام مجرم اور اس کے فرقہ پر لگاتا ہے۔ جسے ”یا ہو“ کہتے ہیں۔ اگر موقع پر ہی وہ ملزم کو مارے تو خون بہا کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر وہ دونوں کو نہیں مارتا تو وہ طلاق کی درخواست کرتا ہے۔ درخواست کی سماعت کے دوران عورت وڈیرے کے گھر رہتی ہے۔ پہلے رطلے میں وہ سردار کے ہاں رہتی تھی۔ اس کے بعد اس کی پھر لب پر شادی کی جاتی ہے اس لب کا کچھ حصہ پہلے خاوند کو دیا جاتا ہے باقی حصہ ہمارا ہوتا ہے۔“

اس موقع پر ایک اور مری دوست نے لقمہ دیا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی پر سیاح کاری کا الزام لگایا لیکن اس نے نہ تو اپنی بیوی کو طلاق دی اور نہ ہی مارا۔ ایسے میں الزام لگانے کے بعد



اُسی وڈیرے کی موجودگی میں ہم خوند سے سلامتی کا پیسہ لے لیتے ہیں۔ اگر اس کے بعد خاوند بیوی کو قتل کر دے تو یہ پیسہ وڈیرہ ضبط کر لیتا ہے۔

جب یہ وفات ختم ہوئی تو ہمارے دوست نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا۔ اس رواج میں ایک اور باریکی ہے ایک عورت کو اگر اس طرح سیاہ کار قرار دے دیا جائے اور اس کی شادی کر دی جائے تو اس کو کسی حالت میں دوبارہ سیاہ کار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور اس کا نیا خاوند یہ حق نہیں رکھتا کہ اس پر سیاہ کاری کا الزام لگائے۔

ہم نے لب کا ذکر پچھلے باب میں بھی کیا ہے۔ یہ مفروضہ نہیں ہوتا کہ بیوی کو لب پر ہی خرید جائے۔ اکثر اولہ بدلہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے گھر میں شادی۔ یہ رسم قریبی رشتہ داروں میں کی جاتی ہے۔ مغرب طبقوں میں لب جانوروں کی شکل میں طے کی جاتی ہے۔ جیسے چالیس بھڑیا یا بیس بکریاں۔ اس کے علاوہ کچھ نقدی بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ طے کرتے وقت کی زیادتی پر بھی بٹھ ہوتا ہے۔ جدھر اچھی رقم ملے وہاں بات چکی ہو جاتی ہے۔ قریبی رشتہ داروں میں یعنی ولی کے ساتھ لب کی رقم کم ہوتی ہے۔ غیروں میں یعنی سیال کے ساتھ شادی طے کرنے میں پیسے زیادہ ہی دیئے پڑتے ہیں۔ یہاں پر شاہیاں اکثر دومرحلوں میں ہوتی ہیں۔ پہلا مرحلہ مگنی ہوتی ہے جسے سیال پر سنگ کہا جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ "نکاح" ہوتا۔ پاکستان کے بعض علاقوں کے رہنے والے ایک اور مرحلہ بھی شامل کرتے ہیں یعنی رخصتی۔

مری دوست "سنگ" اور "نکاح" ہی پر اتفاق کرتے ہیں۔ رخصتی تو نمٹوڑی دیر بعد ہو ہی جاتی ہے سنگ اور نکاح کی تقریب میں اکثر کافی وقفہ دیا جاتا ہے۔ "سنگ" اور نکاح کرنا باپ یا حلقے کے بزرگ کی ذمہ داری ہوتی ہے بزرگ آپس میں مل بیٹھ کر اس معاملے کو طے کرتے ہیں۔ ایک دفعہ جب لب کی رقم طے ہو گئی تو رائفل کا ایک ہوائی فائر کیا جاتا ہے۔ زیادہ خوشی ہو تو کوئی فائر بھی کئے جاسکتے ہیں۔ فائر کرنے سے پہلے لب کی رقم کا کچھ حصہ سسرال والے ادا کرتے ہیں۔ "سنگ" کی رقم کے بعد لب کی شادی شدہ سمجھی جاتی ہے۔

ہم نے مزید استفسار کیا کہ جناب زندگی اور موت کا وقت معین نہیں۔ فرض کیجئے اگر سنگ کے بعد وڈیرہ عورت میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو لب کی رقم جو پیشگی دی گئی ہے اس کا کیا ہوتا ہے؟

ہمارے دوست نہیں کر لو گے۔ ہمارے مداح ہر طرح سے پکے ہیں اس میں کوئی خامی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ اگر فرض کیجئے کہ لڑکی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اب لڑکی کی قسمت بشارت دی تو بہر حال مکمل ہو چکی پیسہ سسرال والوں کا! یہی حال لڑکے کے مرنے پر بھی ہوتا ہے۔ پیسہ ایک دفعہ دے کر واپس نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ لب کی رقم جو باقی رہتی ہے نہیں مانگی جاتی:-

”میں یہ باتیں کہ آپ کے مہاجرین میں جنہیز کی قسم کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟“  
 ”ہاں جنہیز بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی نام کو کچھ تھوڑے بہت زبردستی کو باپ دے دیتا ہے مگر جنہیز دینے پر کوئی زور نہیں ہوتا۔ جنہیز کو ہم ”داج“ کہتے ہیں۔“  
 ”اب آپ نے جب داج یا جنہیز کی بات کی ہے تو جنہیز کے ساتھ ساتھ عورت کی کچھ اپنی ذاتی چیزیں بھی ہوتی ہوں گی مثلاً سیڑا زور وغیرہ۔“

”ہاں ضرور ہوتی ہیں۔ آخر عورت کے بھی ماں باپ اور بھائی ہوتے ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ تو دیتے رہتے ہیں۔“  
 ”فرض کیجئے خاوند کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے رواج کے تحت تو عورت سسرال واپس چلی جاتی ہے اگر شادی کے قابل ہوئی تو پھر بڑے پر دوبارہ شادی تو چیز اور عورت کا ذاتی چیزوں کا کیا ہوتا ہے؟“ ”مرد کے مرنے کے بعد جنہیز اور عورت کا سامان بچوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور وہ خاوند کے باپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ عورت اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ پہلے تو اس کے بارے میں سخت رواج تھا کہ عورت ضرور ہی میکے جائے گی۔ مگر اب عورت بچوں کے ساتھ رہنا چاہے اور اس کی عمر شادی کے قابل نہ ہو تو اس کی اجازت مل جاتی ہے۔ اگر عورت کی کوئی اطلاق نہیں ہے تو پھر عورت اپنا جنہیز لے کر اور ذاتی سامان لے کر میکے چلی جاتی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ عورت کا انتقال ہو گیا تو جنہیز اور عورت کا ذاتی سامان مرد رکھ لیتا ہے۔ اس کے ذمہ دفن اور فاتحہ وغیرہ کے بھی اخراجات ہوتے ہیں۔“

مری علاقے میں قیام کے دوران قبائلیوں سے جب بھی گفتگو میں عورت کا ذکر آیا۔ سب اس بات پر متفق نظر آئے کہ عورت کو سختی سے رکھنا چاہیے اور کام بھی اتنا لینا چاہیے کہ ہوش نہ آئے۔ آخر بیچاری عورت کس طرح ایسے ماحول میں گزارا کرتی ہوگی۔ بس عادت ہی ہو جاتی ہے۔ جو ہمارے بے تکلف مری دوست ہیں ان کے گھر والے ہم سے بات کرنے میں بچکاہٹ محسوس نہیں کرتے بھر جو لوگ فوج کے اسپتال میں آتے اکثر ان سے باتیں ہوتیں

ہمارے دوستوں کی بائیں تو ہم سے اکثر کافی دیر تک باتیں کرتیں۔ ماؤں کو تو اپنی اولاد سے کوئی شکایت نہیں ہوتی بلکہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ ہمارے دوست پہلے ان کے پیر چھوٹے اور پھر گھر میں جاتے مگر بیویوں کو ضرور گلہ ہوتا۔ وہ بھی یہ انتظار کرتی رہتی تھیں کہ کب ان کی اولاد بڑی ہوگی۔

ایک دفعہ ہمارے ایک مری دوست اپنی بیوی کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستے میں مل گئے۔ ہم نے وہاں کو جیپ میں بٹھالیا۔ ان کا چھوٹا بچہ فوج کے اسپتال میں زیر علاج تھا۔ اس وجہ سے خوب واقفیت تھی ان کی دو بیویاں تھیں ایک مرچکی تھی۔ ہم نے ان کی بیگم سے پوچھا کہ جب گھر میں دو بیویاں ہوں تو آپس میں لڑائی تو نہیں ہوتی؟ ہنس کر کہنے لگیں ”کیوں نہیں ہوتی۔ یہ تو فطری بات ہے۔“ ان کے خاوند نے لقمہ دیا ”بیویاں تو ٹھیک جہاں بیویوں کے ساتھ باندیاں ہوں تو وہاں لڑائی کے علاوہ دوسرا کام نہیں ہوتا۔ پھر عورت کے حسد کی کوئی تباہی نہیں ہوتی کٹر عورتیں تو اپنے خاوند کو زہر دینے سے بھی گریز نہیں کرتیں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ کہنے لگی کہ آپس میں مردوں کو لڑنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کیل ہے یا پھر عورتیں باپ کے ساتھ اکٹھے ہو کر مرد کے خلاف محاذ قائم کرتی ہیں اب بیچاہہ گھر میں اکیللا رہ جاتا ہے یا پھر اگر اولاد بڑی ہوتی تو اولاد کا ہمارا لے کر مرد پر زور ڈر جاتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اولے بدلے کی شادی ہوتی ہے تو پھر ایک دوسرے پر نذر قائم رکھتے ہوئے مرد کی حکومت کو کمایا جاتا ہے ہمارے دوست کی بیگم صاحبہ منہ پر چادر رکھے ہوئے مسکراتی رہیں آخر کب تک مبرکتیں۔ کہنے لگیں آپ لوگ اپنی حرکتوں کو بھی دیکھیں۔ خاص طور سے وڈیرے لوگ کسی غیر عورت سے تعلق رکھنے پر تو آپ فخر محسوس کرتے ہیں اگر عورتیں اس پر برا مانجتی ہیں تو مرد یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ وڈیرے لوگ تو عزت والے ہیں چاہے چار بیویاں رکھیں یا دس باندیاں۔ ہمارے دوست نے یہ بات سن کر کھینا سا جواب دیا۔

”نیک بخت میں نے تیرے ساتھ کب زیادتی کی۔ دوسری بیوی تھی مرگئی۔ اب تو تو آرام سے ہے۔“  
 بیگم صاحبہ کہنے لگیں ”میں تیری بات تو نہیں کر رہی۔ میں تو عام بات کر رہی ہوں۔“  
 میاں بیوی کی یہ بات دلچسپ ضرور تھی مگر ایک مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا سبب وڈیروں کی لاقانونیت ہے اور اس لاقانونیت کا شکار عورت بھی ہے۔







## شاہجہ جگر

مری معاشرے اور رہن سہن کی جھلک تو آپ نے دیکھ لی۔ اب یہاں کے نظم و نسق کے ایک خاص پہلو پر نظر ڈالتے ہیں جسے جگر کی روایت کہلاتا ہے۔ قبائلی رسم و رواج کے تحت جگر کے کاغذ بہت پرانا ہے۔ بالوں جیسے جہاں قبائلی سوسائٹی ہو گی وہاں جگر کا رواج ہونا لازمی ہے۔ انسان جب سے پیدا ہوا ہے پیارا اور محبت کے ساتھ لڑائی و مار مٹائی لازم و ملزوم ہیں۔ اچھائی کے ساتھ اگر برائی نہ ہو تو اچھائی کو پہچانے کون بڑائی جھگڑا کرنا جب فتنہ فطرت ہے تو جھگڑوں کا فیصلہ کیونکر ہو، ہر ایک جھگڑا تو اتنا سنگین نہیں ہوتا کہ اس کا انجام بربادی ہو۔ فیصلہ اور سزا بھی ہو سکتی ہے۔ تو قبائلی سوسائٹی کا رواج ہے کہ اگر قبیلے کا اندرونی جھگڑا ہے تو بڑے بڑے میٹھ گئے اور انہوں نے فیصلہ دیدیا۔ اب بھی اکثر اچھے گھرانوں میں یہ طریقہ رائج ہے۔ ہاں ماڈرن سوسائٹی کی بات نہ کیجئے وہاں بزرگی کا کوئی معیار نہیں۔ سب ہی بزرگ اور سب ہی بچے۔ پھر تو فیصلہ عدالت میں ہوگا اور ہوتا ہے۔ معاشی ترقی کے جہاں فوائد ہیں۔ وہاں نقصانات بھی ہیں پھر نفع کے ساتھ نقصان بھی برداشت کیجئے۔ یہ تو خیر بڑی بحث طلب بات ہے کہ سوسائٹی کی اس طرح تشکیل دی جائے جہاں ترقی کے ساتھ نقصان کا احتمال کم ہو۔ ہاں تو قبیلے کے دائرے میں رہتے ہوئے تو قبیلے کا طریقہ ہو گیا۔ لیکن اگر کسی اور قبیلے کے ساتھ جھگڑا ہو جائے تو!

تب بھی جناب قبیلے کے بڑے بوڑھے جنہیں آجکل کی زبان میں معتبرین کہتے ہیں اکٹھے ہو گئے اور صلح معافی کرا دی کسی کو سزا دینا منظور ہوئی تو سزا دے دی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ صلح معافی رواج کے تحت ہوتی ہے مثال کے طور پر سیاہ کاری ہے۔ اگر کم تر ذات کے ساتھ ہے جیسے کوئی مرٹھا (مرٹھا ایک قبیلہ ہے) تو وہ جائز ہے۔ اگر ہم پہلے قبیلے کے ساتھ ہے تو جناب یا تو موقع پر ہی ہلاک کو ختم کر دیا جاتا ہے ورنہ جو بھی فیصلہ بڑے بوڑھے یا معتبرین دیں۔ بڑے بوڑھوں کے اس طرح بیٹھ کر فیصلہ دینے کے طریقے کو جرگے کی روایت کہتے ہیں۔

فرنگی کی پالیسی ہمیشہ کم خرچ بالانشین دلا رہی ہے۔ جس علاقے کو ترقی سے کوئی فائدہ نہیں تو بیکار خرچ کرنا حماقت ہے۔ امن تو قائم رکھنا بہر حال لازمی ہے۔ چاہے ترقی ہو یا نہ ہو۔ لوگ جاہل رہیں تو بلا سے رہیں۔ بھید کے مرتے ہیں تو مرنے دو۔ آپس میں لوٹ مار کرتے ہیں تو آپس ہی میں کرتے ہیں۔ فرنگی مفاد کو تو کچھ نہیں کہتے۔ فرنگی فوج یا اس کے کارندوں کی نقل و حرکت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ آسان طریقہ ہے آپس میں جھگڑنے دو۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکار برطانیہ نے ۱۸۷۱ء میں فرنٹیر کرائم ریگولیشن (FRONTIER CRIMES REGULATIONS) نافذ کیا جو بھی ملک رائج ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس قانون میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس قانون کے تحت جرگے کی روایت کو برقرار تو رکھا مگر حکومت کا ہاتھ پھر بھی اونچا یعنی مقدمے کے فیصلے کی توسیع یا جرگے کی کوئی بھی کارروائی بغیر پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کمرنی یا ان کی مہربانی کے عمل میں نہیں لائی جاسکتی۔ بالفاظ دیگر پولیٹیکل ایجنٹ صاحب سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ ان کے فیصلے کی اپیل بھی کسی عدالت میں نہیں ہو سکتی جس نے چون چرانک بٹا دیا جرگے سے کوئی بھی بونے کیوں پنا نجی مفاد بھی شامل ہے۔ گدی جو جاتی رہے گی۔

انگریز جب بھی کوئی قانون بناتا تھا تو کافی آگے کی سوچتا تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ رائے عامہ بھی ہموار ہو اور علاقے کے لوگوں کی نفسیات کا بھی خیال رکھا جائے تاکہ آئندہ سو سال تک کوئی تکلیف نہ ہو جب اس نے فرنٹیر کرائم ریگولیشن کو ۱۸۷۱ء میں تشکیل دیا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت ترمیمیں ہوتی رہی مگر ہمیشہ واسطہ رواج کا دیا کہ رواج اور طور طریقے برقرار رکھے جائیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب بھی جی میں دبا رہا لگاتے۔ ذکر پہلے رواج ہی کا ہوتا۔ ایک ایسی تقریر نمونے کے طور پر نیچے درج ہے جو کہ کرنل بیوچپ

لے جی بی (COL SIR BEAUCHAMP - AGG) نے ۱۹۳۰ء میں سٹی دربار کے موقع پر کی تھی اس وقت جبکہ ہندوستان میں سیاسی غلغلہ تھا یہ ضروری ہے کہ آپ لوگ اپنے گھر کو درست رکھیں بے انصافی اور بد عزتی یہاں نہ آنے پائے۔ آپ کی روایات و رواج ہر حالت میں قائم رہنا ضروری ہیں۔ تہذیب و تمدن کا پھیلتا ہوا الو فان چلے کتنا ہی مہیب کیوں نہ ہو۔ ان رواجوں کو جو آپ کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملے ہیں ہر قیمت پر درخشاں رکھنا ضروری ہے تاکہ یہی ورثہ آپ کی آنے والی نسلوں کو بغیر تبدیلی کے نصیب ہو۔

بینک دنیا ترقی کرتی ہے تو کرنے دو۔ یہاں اسکول نہ بنے پائیں۔ سڑکیں نہ کھلے پائیں معاشی ترقی کا

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ ہوا تو رواج کیسے قائم رہے گا۔ تعلیم یافتہ تو پھر دورِ حاضر کے طریقے پر سوچے گا۔ آپس میں آہنا ابھی ہگا۔ لوگوں کی دماغی وسعت بھی بڑھے گی پھر فرسودہ نظام کو کون مانے گا۔ زنجیریں توڑیں گی سرکار برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کے مفاد کو ٹھیس پہنچے گی۔ اسے صاحب جانے دیں۔ آپ لوگوں نے آزادی کے بعد کون سا تیر مارا۔ قائد اعظم نے تو بینک ۱۹۳۷ء میں بلوچستان کا علیحدہ صوبہ بنانے کے لئے کہا تھا اور پھر یہاں کے لوگوں نے بیک زبان پاکستان کے قیام کے لئے باور پذیر حمایت کی تھی۔ دیکھیں شاہی جرگے کی قراردادوں جو ۱۹۴۷ء میں پاس ہوئی صرف ایک ووٹ ہی تو خلاف تھا۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد کیا ہوا۔ آپ کو بھی علم ہے اس علاقے میں بھی ایک فرنٹیر کمرنگویشن قائم۔ وہی جرگے۔ وہی رواج اور وہی وڈیرے مان لیا ایک دم سے تو یہ نعمتیں ختم نہیں ہو سکتیں۔ ویسے پچھلے دوسالوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں کاش یہ سب باتیں تو یہ نوبت آتی۔

فرنٹیر کمرنگویشن کے تحت یہاں تین جرگے ہوتے ہیں۔ لوکل جرگہ تو سب ڈویژن کی سطح پر ہوا۔ ڈویژنل جرگہ۔ یہ جرگہ ڈویژن کے لئے ہوتا ہے۔ سب سے اعلیٰ جرگہ شاہی جرگہ کہلاتا ہے۔ یہاں تین شاہی یعنی امپریل جرگے کی۔ اس کے ممبران تمام بلوچستان سے تعین کیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر سردار صاحبان ہی اس کے معتبر ہوتے ہیں۔ حکمرانی اپنے لوگوں کی ہے۔ حکمرانی کی جب بات آگئی تو خیال یہ رکھئے کہ ذکر یہاں صرف قبائلی علاقے کا ہے ناکہ سیٹلڈ علاقے (SETTLED AREA) کا۔ حکمرانی سے مراد چکی حکمرانی۔ اس میں کچھ شک کی گنجائش نہیں۔ دیکھئے ناب ان کے اپنے علاقے میں ان کے اپنے تھانے ہوتے ہیں جنہیں ایوی تھانہ



کہا جاتا ہے 'ان کی اپنی پولیس ہوتی ہے جسے لیوی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے جس کو خوش کرنا ہوا لیویز  
تھانے بنائیے اور لیوی' بھرتی کرنے کی اجازت دے دی۔ ان سب کا خرچ پہلے حکومت برطانیہ برداشت  
کرتی تھی اب یہ حکومت پاکستان کے سرے خرچ کی بھی خوب رہی۔ اکٹھا پیسہ سردار کے سپرد کیا۔ انہوں نے اپنے  
آدمی کچھ رکھے کچھ نہ رکھے۔ زیادہ تر پیسہ اپنی جیب میں۔ آپ کو امن و امان کی ضرورت ہے تو وہ رہے گا  
بشرطیکہ جیب گرم رہے۔ اپنی جیلیں بنائیں۔ جس کو مرنی کی بند کیا جس کا گھر یا بھلیا وغیرہ وغیرہ۔ خیر اب  
جیلیں تو ختم ہو چکی ہیں لیوی تھانے ٹوٹ چکے ہیں یا ٹوٹ رہے ہیں بعض علاقوں میں لیوی کارواج  
بھی ختم ہو چکا ہے اور باقی بھی جلد ہی ہٹ جائیں گے۔ لیویز پر مفصل بحث ہمیں اور کی جائے گی ابھی تو ذکر  
جرگے کا ہو رہا ہے۔

معمولی مقدمات کو مل جرگے کے سپرد کیے جاتے ہیں اسی طرح سنگین جرائم کی سنوئی ڈویژن جرگہ کرتا ہے  
اور پھر بین الاقوال جھگڑوں کا فیصلہ یا سنگین تر جرائم کی سنوئی صرف شاہی جرگہ کرتا ہے۔ جرائم کا فیصلہ  
دینا ہی ان جرگوں کا کام نہیں ہوتا بلکہ جب بھی حکومت کو کسی چیز کے بارے میں رائے سامہ ہو کر کرنے کی ضرورت  
ہوتی طلب کر لیا شاہی جرگے کو اور بیان دلوادیے۔ انگریز نے تو بار بار کیا۔ اگر رواج اپنی سہولت کے لئے  
بدلنے کی ضرورت محسوس کی تو قرار داد شاہی جرگے نے پاس کر دی۔ کسی سردار کو بدناما ہوا یا کسی کا رتبہ بڑھا  
ہوا تاکہ آئندہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ بلایا شاہی جرگے کے سامنے۔ بندھوادی اس کے سر پر گدپی اور پھر  
ممبر بھی بنوایا شاہی جرگے کا۔ ممبر بنانے کے ساتھ ساتھ مراعات بھی دے دیں مراعات ہمیشہ روپے پیسے کی  
ہوتی ہیں۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ آج سے بیس سال پہلے تک جرگے میں صحیح انصاف ہوتا تھا۔ کوئی بھی جرم کسی وقت  
میں ہوا۔ مقررین اور معتبرین نے مجرم کو کپڑا اور جرگے کے سامنے لائے۔ جہاں موسائی محمد دودھو سب  
ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ روپے پیسے کی لعنت ماسولے چندے ٹھام کو نہ لگی ہو تو جرم کدھر چھپتا ہے  
سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ اپنے رواج اور دستور کے پابند ہی نہیں بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں جو کہ سنہ  
سال سے چلے آ رہے ہیں چاہے کیسے بھی ہوں۔ جہاں ہر ایک سسٹم کی برائیاں ہیں وہاں خوبیاں بھی ہیں۔ چندال

پہلے کوئی سیاسی پارٹی تو تھی نہیں اور اگر تھی بھی تو سرداروں کے رحم و کرم پر انہیں کی رائے عوام کی رائے لیکن اب کچھ حالات مختلف ہیں۔ اب جرگے کو خاص طور سے پڑھے لکھے پسند نہیں کرتے "جناب جرگہ ممبر بننے کے لئے اس میں سیاسی نعرہ بھی آ گیا ہے۔ لوگ بھاگ دوڑ کر کے چاہے معتبر ہوں یا نہ ہوں ممبر بن ہی جاتے ہیں۔ پھر روپیہ پیسہ اور تعلیم کے ہوتے ہوئے لوگ رواج اور دستور کا بھی خیال کم ہی کرتے ہیں۔"

تعلیم اور روپیہ پیسہ کی ملاوٹ سے اخلاقی تدریس بدل ہی جاتی ہیں۔ آپٹینس یا نہ مانیں آپ کی مرضی۔ ان کو روکنا ذرا مشکل کام ہے۔ خاص طور سے ان حالات میں جبکہ پرانا نظام دم توڑ رہا ہو اور نئی قدریں ان کی جگہ لے رہی ہوں۔ یہ تو ٹرانزیشن پیریڈ (TRANSITION PERIOD) ہے۔ یہ بدلتا دور تو اپنا وقت لے گا تاوقتیکہ حالات اعتدال پر نہ آجائیں۔ بیگانہ یہ ہے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ حالات کو اعتدال کی طرف رخ کرا چاہیے۔ اپنی اخلاقی قدروں کو سرے سے پامال نہ ہونے دیں۔ سرداری اور ڈیرہ کشاہی کو ہٹا کر اخوت اور مساوات کو قائم کیجئے جو کہ اسلامی اصول ہیں۔ سیاسی وقت ممکن ہے جبکہ مثبت جذبات یعنی محبت باہمی احترام کا فروغ ہو اور منفی جذبات یعنی نفرت و حقارت کو قابو میں رکھا جائے۔ بجائی فلسفے کی حد تک تو یہ بات صحیح ہے مگر سوچیے؛ بنیادی چیز درست تعلیم ہے۔ گھر اور اسکول دونوں کی اس پر محکمہ تعلیم اور والدین دونوں غور فرمائیں۔ تعلیم کا ذکر جب ہو ہی رہا ہے تو ایک ماہر تعلیم کا نظریہ بھی گوش گزار کر دیا جائے ان کی رائے ہے کہ کسی بھی ملک میں تعلیم کے دراصل تین اہم مقاصد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر ایک شخص کو لکھا پڑھنا آتا ہو۔ آخر تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان کا دینی فرض ہے۔ مگر بنیادی تعلیم بغیر کسی ہنر کے بیکار رہے۔ یہ تعلیم تو عام ہونی چاہیے۔ دوسرے مقاصد اور بھی اہم ہیں۔ جن پر کسی بھی ملک کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے ہر ایک ملک کا اپنا رائج شدہ نظام ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اشتراکیت سرمایہ داری وغیرہ وغیرہ ہر ایک ملک کا رائج اور معاشرتی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی ایک نظام کو اپنا لے۔ اپنا تے وقت نیشنل ازم، معاشی ترقی اور قومی کردار جو کہ اخلاقی قدروں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ جہاں تک اپنے ملک کا سوال ہے تو جناب یہ تو اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ جب اسلام کا نام آگیا تو جناب راہ عمل تعین کرنے میں کوئی شوریٰ درپیش نہیں ہونی چاہیے تو تعلیم کو بھی ان ہی اصولوں پر استوار کیجئے تاکہ ہر ایک پاکستانی کو راہ عمل پر یقین ہو۔

یقین کے بغیر ترقی ترقی ہوتی ہے۔ نہ ہی ایک جہتی قائم رہتی ہے اور نہ ہی ملک کا صحیح دفاع ہو سکتا ہے اب ہم کی آخری بات تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے تعلیم کو عام کر دیا تو یہ یاد رکھئے کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں تقریباً فیصدی ایسے لوگ ابھرتے ہیں جو کہ ملک کے مختلف شعبوں میں ترقی کے حامل ہوتے ہیں۔ تو ان کے چناؤ ذہنی ارتقاء اور انہیں تعلیمی سہولتوں کے لئے آسانیاں بہم پہنچانی ضروری ہیں آپ کے سامنے چین کی مثال موجود ہے۔ انقلاب سے پہلے تعلیمی لحاظ سے وہاں کی حالت ناگفتہ بہ تھی لیکن دیکھئے دیکھئے اب اس ملک کی حالت کیا ہے۔ آج کل سرمائے کے پھیلاؤ کا ذکر تو ہوتا ہی رہتا ہے تو پھر معاشی انصاف بھی لازمی ہے۔ دولت کی تقسیم ہے انصاف سے کیجئے۔ زیادہ پیسہ اور زیادہ طاقت ایک جگہ درست نہیں۔ سرکار اور وڈیروں کو تو جانہیہ کاغذ پر تو چلے گئے مگر ان کا اثر کم ہوتے ہوتے کچھ دیر تو لگے گی۔ نئے نظام کو امتثال کا خیال رکھتے ہوئے رعب کیجئے۔

ہاں فوجیہ کے کا اعلان ہوا کہ بتاریخ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء بمقام کوہو قرار پایا ہے۔ ہر کارے اگستے گئے گئے جو کہ لیویز کی شکل میں ہوتے ہیں اور پولیٹیکل اینجینٹ صاحب نے دعوت نامے جاری کر دیئے یہ دعوت نامے تقریباً ایک ماہ پہلے جاری کئے گئے تھے۔ اب علاقہ بھی تو کافی پھیلا ہوا ہے۔ مقدم اور وڈیرے تو دور دراز جگہوں پر ہیں تقریباً ہر جگہ پیدل یا گھوڑوں پر جانا پڑتا ہے بس گھس بننے سے کافی آسانی ہو گئی ہے یہ طے ہوا تھا کہ جرگہ تین دن تک رہے گا۔ دراصل یہ جرگہ نہ تو شاہی تھا نہ ڈویژنل اور نہ ہی لوکل اس کی اپنی نوعیت تھی اس جرگے کے لئے دعوت نامے ہر معتبر اور وڈیرے اور مقدم کو بھیجے گئے۔ نام شاہی جرگہ کا ہوا۔ چلئے نام سے کیا ہوتا ہے کام سے مطلب آپ یہ پوچھیں گے یہ تین درجے کیا ہیں۔ یس یوں سمجھیں کہ عزت کا معیار ہے۔ جو سا ہمارا سال سے چلا آرہا ہے۔ آپ سے کیا پردہ چونکہ حالات کافی بہتر ہو چکے ہیں اس جرگے کا بلانے کا مقصد یہ تھا کہ مقدمات معتبرین اور وڈیروں کو اکٹھا کیا جائے اور ان سے مری علاقے میں حالات کے بارے میں تبادلہ خیالات ہوں اور ان کی رائے بھی لی جائے کہ حالات کو اور کیسے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ابھی تک فرار ہیں یا بقول شخصے ابھی تک پہاڑوں پر ہیں انہیں دلاسہ دے کر نیچے لایا جائے پھر سب سے اہم بات یہ کہ مقدمات وڈیروں اور معتبرین کو امن و قرار کبھی نہ اس کی ذمہ داری کا احساس بھی دلایا جائے جس کے لئے وہ مراعات لیتے



رہے ہیں۔

مہانداری تو دو تین دن پہلے سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ پیدل چل کر آئے کچھ گھوڑوں پر چسپاں اور سرکاری سواریاں بھی مہیا کی گئیں۔ ٹھہرنے کے لئے کوہ کے معوزین نے گھر خالی کر دیئے مگر مہان تو چار سو سے اوپر ہی ہوں گے لیکن جرگے میں شامل ہونے والوں کی تعداد اسی تھی۔ بھٹی وڈیرے لوگ جب کہیں جاتے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا آدمی اتنے ہی حلی موالی اس کے ساتھ ان سب کی مہانداری حکومت کا فرض ہے۔ یہ تو دربار ہے جو پلا آرہا ہے۔ دونوں وقت سبکی کا ہونا ضروری ہے اگر نہ ہو تو ناراض ہو جائیں۔ اب بیچارے کہاں ناراض ہوتے ہیں اور خاص طور سے آجکل۔ یہ پُرانی باتیں ہو گئیں کہ کھانا ٹھیک وقت پہنچا تو لوگ ناراض ہو کر اٹھ بیٹھے۔ جگہ رتبہ کے لحاظ سے نہ رکھی تو نارباد شاہ سلامت ہم کھڑک گئے۔ یہ لوگ غمزے بھی کرتے تھے اور ان کے غمزے برداشت بھی کئے جاتے تھے۔ کیونکہ سرکار برطانیہ کے لئے مذہبی سے خدمت بھی بجالاتے تھے۔ خلعت ملتی تھی۔ زمینیں دی جاتی تھیں۔ جاگیریں ہوتی تھیں۔ وہ بعد میں بھی ہوتا رہا ہے۔ بیچارے عام آدمی تو کچھ عام ہوئے نا۔

جرگہ مال یک بڑے شامیلان سے بایا گیا تھا۔ وڈیرے اور مسترین ایٹج کے سامنے بیٹھے تھے ایٹج کے ایک طرف مقدمین اور شاہی جرگہ ممبران دوسری جانب سول انسران ایٹج پر پولیٹیکل ایجنٹ، کسٹمر صاحب اور چیف سکریٹری۔ پریس ک جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ دعوت نامے بھی بھیجے گئے تھے لیکن پریس انسر کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

پہلے کسٹمر صاحب نے تقریر کی پھر چیف سکریٹری صاحب نے آپ لوگ خود دیکھ رہے ہیں کہ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں ہر جگہ ترقی اور تعمیری کام سرانجام دیئے جا رہے ہیں۔ یہ کام جب ہی جاری رہ سکتے ہیں کہ علاقے میں امن و امان ہو۔ کچھ لوگ ابھی تک فرار ہیں شاید ڈر کی وجہ سے ان لوگوں کو ابھی تک یقین نہیں ہے کہ حکومت انہیں معاف کر دے گی۔ وزیراعظم صاحب کا اعلان بالکل دانش مندانہ ہے کہ پندرہ دسمبر تک عام معافی ہے۔ آپ لوگوں کو ذمہ داری ہے کہ انہیں سمجھا کر واپس لائیں۔ بغیر تعلیم اور تعمیری کاموں کے ترقی ممکن نہیں۔ آپ لوگوں کو اپنی آئندہ نسل کا خیال ہونا چاہیے۔ یہاں تعلیم ایک فی صدی سے بھی کم ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ امن و امان



قائم رکھنے کے لئے آپ لوگوں کو واضح منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔ تاکہ آپ کے اپنے علاقوں میں گڑبڑ نہ ہو۔ یہ تو یہاں کا رواج اور دستور ہے۔ اب چونکہ تعمیری کام ہو رہا ہے۔ آپ ہم لوگوں کو بتائیں کہ آپ کی کیا ضروریات ہیں اور انہیں کیسے پورا کیا جاسکتا ہے؟

تقریریں ختم ہوئیں تو سب ایک ساتھ بولنے کی کوشش کرنے لگے۔ کوئی بلوچ میں بولتا اور کوئی اردو میں کمشنر صاحب نے سب کو خاموش کیا اور استدعا کی کہ برائے مہربانی ایک ایک کر کے بولیں۔ ڈیڑھ صفر خان کھڑے ہوئے، دائیں بائیں دیکھا خاص طور پر سردار قیصر خان کی طرف جو سردار خیر بخش مری کے بھائی ہیں اور مقدمین کی قطار میں بیٹھے تھے۔ جناب ہمارے رسم و رواج کے مطابق ہمارا سردار ہی سب کچھ ہوتا ہے، اب سردار خیر بخش کی جگہ سردار قیصر خان ہیں۔ آپ نے ذکر امن و امان کا کیا تو فرمادی ہے کہ ہیں یعنی سارے مقدمین کو سردار سے ملنے کی اجازت دی جائے تب ہی ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔

ابھی صفر خان کی تقریر جاری تھی کہ دوسرے کونے سے کچھ ڈیرے جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے ان سب کا روئے سخن افسران کی جانب تھا کبھی کبھی قیصر خان پر بھی نظر ڈال لیتے۔ ان سب بولنے والوں میں سب سے زیادہ اونچی آواز ڈیڑھ نہال کی تھی "کہاں اور کب کی بات کرتے ہیں آپ لوگ؟ آج کل جمہوریت اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ایک آدمی کی رائے کوئی رائے نہیں ہوتی۔ فیصلہ ہم سب نے مل کر کرنا ہے نہ کہ اکیلے سردار نے۔" بات کچھ بڑھتی ہوئی نظر آئی تو پھر کمشنر صاحب نے خاموشی کی استدعا کی۔ ڈیڑھوں معتبرین اور مقدمین میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ ڈیڑھ نہال کی بات کافی حد تک درست تھی مگر کچھ لوگ سردار کی طرف داری بھی کرنا چاہتے تھے۔ زیادہ تر طرفین کی باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بیچ کا راستہ اختیار کرنے پر تیلے ہوئے تھے۔ کیا یہ کل پھر سرداری نظام آجائے۔ پہلے بھی دوبار ایسا ہی ہو چکا ہے۔ ہر ایک کو اپنی جان، بیوی اور بچے عزیز ہوتے ہیں۔ پھر ویسے بھی بیچ کا راستہ درست ہوتا ہے۔

"جناب سردار سے ملنے کی وجہ یہ نہیں کہ ہم ان کے کہنے پر چلیں گے ہمارا مقصد یہ ہے کہ سردار صاحبان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ قوم برباد ہو رہی ہے۔ نہ تعلیم ہے نہ اسکول اور نہ سرٹکس۔ مکمل امن و امان اگر قائم نہ ہوا تو ترقی میں دیر لگے گی۔ بہتر یہی ہے کہ دوسنی کی راد اختیار کر لی جائے۔"

وڈیرہ نہان پھر جوش میں اٹھا " اگر مردار نے نہ مانا تو:

اس پر خاموشی سی ہو گئی پھر چہ میگوئیں شروع ہوئیں۔ بحث کا رخ بدلا " ہمارا ایک اور مطالبہ ہے کہ ہمارے جو ہتھیار لے لئے گئے ہیں وہ واپس کئے جائیں۔ آپ صاحبان یہاں کے حالات سے واقف ہیں۔ ہمارے چاروں طرف اور جو قبائل رہتے ہیں ان سب کے پاس ہتھیار ہیں۔ ہمارا جھگڑا کہتران، لونوں، ورنچیوں سب ہی سے ہے اب پوندے اور شنواری بھی آئے شروع ہو گئے ہیں ہم اپنی اور اپنے جانوروں کی حفاظت بغیر ہتھیار کیسے کریں گے؟

اس بات پر سب مہرے مہرے ہونا بھی جائز تھا۔ "خواب اگر آپ ہیں ہتھیار نہیں دے سکتے تو ان سب کے بھی ہتھیار واپس لے لیں: سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کوئی آہستہ بولا کوئی غصے میں آکر کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے بوچی میں تائید کی کسی نے اردو میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ جب سب کہہ چکے تو وڈیرہ کریم داد جوش میں کھڑا ہوا: ہم حکومت کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ افغانستان کو غلط پروپیگنڈے سے روکا جائے، ان کا ریڈیو ہماری بوچی غیرت کو بار بار لٹکا رہا ہے ہم خاموش تماشا ہی نہیں رہ سکتے۔ اگر حکومت ایسا کرنے سے قاصر ہے تو ہمیں اجازت دی جائے ہم خود حکومت افغانستان سے نمٹ لیں گے، ہم افغانستان کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی سالمیت کے لئے ہم جان دینے کو تیار ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے یہ ہمارا بھی معاملہ ہے۔"

ابھی وڈیرہ کریم داد بول ہی رہا تھا کہ ممبرین میں سے میر و خان کھڑے ہو گئے۔ "صاحب ہماری کچھ میں نہیں آتا کہ ریڈیو افغانستان ایک مری سردار کا نام لے کر پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ مری افغانستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس سردار کا نام مہربان خان تھا ہے۔ ہم سب یہاں ہیں ہم میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں کہ مہربان خان کون ہے۔ چلئے اگر مان بھی لیا جائے کہ ایک مہربان افغانستان چلا گیا ہے تو باقی ان ہزاروں مہربانوں کا بھی ذکر کرے جو پاکستان میں بڑبڑ افغانستان کی حکومت سے تنگ آکر یہاں آ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مری غیرت کو نہیں دیکھا ہے۔ ہم یہاں سے کیوں جائیں۔ پاکستان ہمارا وطن ہے غبی معاملے کس ملک میں نہیں ہوتے۔"

اس سلسلے میں کافی بحث ہو چکی تو بات ترقی کی شروع ہوئی۔ جناب ہماری استدعا یہ ہے کہ ترقی کی رفتار کو برقرار رکھا جائے، ہم اپنی فوج کے بچہ شکر گزار ہیں کہ وہ اتنی جانفشانی سے ترقی کے کاموں میں حصہ لے رہی

ہے۔ مکان بن رہے ہیں، کنوئیں کھودے جا رہے ہیں۔ ٹوبہ دہل لگا رہے ہیں، سڑکیں بنا رہے ہیں، کہیں ان لوگوں کے جانے کے بعد کام سست نہ پڑ جائے۔

بحث مباحثہ۔ چھ میگزینیاں اور کٹ چھانٹ جاری رہی اب معاملہ ذمہ داری کا اُٹھا۔ ہم لوگ اپنے علاقے میں ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، ہمیں معلوم ہے کون باہر سے آیا اور کیا۔ بشرطیکہ ہمارے ہتھیار دے دیئے جائیں اور حکومت ہماری مدد کرے۔

سردار قیصر خان کو کچھ اختلاف تھا۔ یہ کہان سے پندرہ دھڑیوں کے ساتھ آئے تھے، ہمارے آئے ہیں علاقے میں ذمہ داری لینا مشکل ہے۔ ہم لوگ خود شہنشاہوں سے تنگ ہیں۔ ہماری اپنی جان خطرے میں ہے اگر ہم ذمہ داری لیتے ہیں اور خدا نخواستہ کچھ ہمارے علاقے میں ہو گیا تو آپ لوگ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے سب لوگ چاہتے ہیں مگر ذمہ داری کا سلسلہ مشکل ہے۔

”صاحب کیسے مشکل ہے۔ شہنشاہی ہی قوم میں سے ہے، ہر ایک دھڑی کو معلوم ہے کہ اس قبیلے کا کون بد معاش ہے اور کہاں بد معاشی کرے گا۔ راشن اور ہتھیار بھی جہاں سے آتے ہیں وہ بھی ہم جانتے ہیں، اگر ہم سب سچے دل سے خواہاں ہیں کہ امن و امان قائم ہو تو یہ کارروائی بند کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ سب رُڈ اسی وجہ سے ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ اپنے مفاد کے لئے دو ٹی پانیسی پر چل رہے ہیں۔“

کچھ کو غصہ آیا، کچھ ہنسے، کچھ سنجیدہ رہے، بات سے بات نکلتی رہی۔ کمشنر اور چیف سکریٹری صاحب دلچسپی لیتے رہے اور ایک طرح سے ماڈریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے، بات زیادہ تر جرگے والے ہی کرتے تھے چیف سکریٹری صاحب نے بڑے تحمل سے کہا: آپ لوگ سب جانتے ہیں کہ حکومت کیا چاہتی ہے۔ اب آپ لوگ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کام کس طرح خوش اسلوبی سے انجام دیا جا سکتا ہے، آج کا دن آپ کے پاس ہے کل بھی آپ لوگ سوچیں اور آپس میں صلاح مشورہ کریں، اس دوران جب بھی آپ چاہتے ہوں کہ ہم لوگ ساتھ شامل ہو جائیں آپ ہمیں بلائیں، لیکن کل ضرور آپ لوگ ہمیں اپنی رائے اور مشوروں سے کلی طور پر مطلع کریں۔ ہم لوگ ٹھک کر چلے گئے مگر میں ذاتی طور پر جرگے کے ماحول سے بید متاثر ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس قسم کا کام جہاں اتنے لوگ شامل ہوئے تقریباً آٹھ سال کے بعد ہو سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو جس کے دل

میں آتا ہوتا۔ شروع شروع میں ضرور بولنے والوں میں سمودی جھمک نئی کہ وڈیروں نے مقدین کی طرف دیکھا۔ فیروز خان یا افسران کی طرف نگاہ ڈالی مگر بعد میں کھل جھٹ تھی۔ کچھ دل کی بھر اس نکالی کبھی کسی پھر عین بھیجی۔ افسران کو بھی تختہ مشق بنایا۔ ظاہر ہے آٹھ سال سے اور پھر خاص طور سے فوجی کارروائی کے بعد سے پہلی مرتبہ باہمی تبادلہ خیال کا خلا ٹوٹا تھا۔ یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ اسی خلا کو پر کرنا ہے۔ کاش وڈیروں کے ساتھ یہاں کے عوام بھی نمائندے ہوتے۔ اسے تو جناب دیر لگے گی۔ صدیوں کی بات اتنی جلدی ختم نہیں ہوتی جب تک حکومت پوری طرح سے قائم نہ ہو جائے اور کسی حد تک جان اور مال کی حفاظت نہ سنبھال لے اور پھر بڑی بات تعلیم جب تک یہ باتیں ہوں تو نمائندے تو یہی رہیں گے مگر عام آدمی سے ربط قائم کرنے کے لئے کون روکتا ہے۔ بسم اللہ تو ہونے چاہیے اور فوری ہونی چاہیے۔ عام آدمی کی بات بعد میں ہوگی۔ ابھی انہی مقدین وڈیروں اور معتبرین ہی کو لے لیں۔ اس جرگے سے پیسے جب بھی انہیں بلایا جاتا تو یہ لوگ کھل کر بات نہیں کرتے تھے۔ ربط تو کوئی خاص تھا نہیں۔ کچھ جھمک کچھ ڈنڈہ در کچھ حزام۔ جب تک آدمی کھلے نہیں تو سچی اور دل کی لگی بات کیسے ہو اور کیسے ان لوگوں کو یقین آئے کہ جو آپ کہہ رہے ہیں سچ ہے اور کیسے یہ بھروسہ کریں کہ حکومت کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

یہاں پر جہاں اور بہت سے خلا موجود ہیں یعنی تعلیم کا خلا۔ رسل و رسائل کا خلا۔ ترقی کا خلا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب سے اہم خلا عوام کے ساتھ باہمی تبادلہ خیالت کا خلا ہے جسے انگریزی میں INTER PERSONAL COMMUNICATION GAP کہتے ہیں۔ تو جناب یہ خلا موجود تھا اور اب بھی کسی حد تک ہے۔ آج کل کے حالات کی نوبت بھی اسی خلا کی بنا پر ہوئی۔ آپ کا لکھنا بھی چاہتا ہے کہ عام آدمی سے بات کریں اور اس کی بھی سنیں مگر ”زبان یا من نرکی“ من ترکی نمی داعم“ لہذا جو آپ اس سے کہنا چاہتے ہیں وہ سمجھتا نہیں۔ اب جو کچھ وہ سنتا ہے اپنے وڈیرے معتبر یا مقدم سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری وڈیریں اُنہی جاییں کی پر ہے تمہارے جانور اور زمینیں چھین لی جائیں گی پس ہے اب اس خلا فہمی کو کون ددرے۔ عام آدمی جب مشکوک ہے تو آپ کے پاس کیسے آئے اور اُنہی کے تو کھلے کیسے۔ جب سے مڑوں پر کام شروع ہوا ہے اور پھر حال ہی میں اور ترقیاتی کام شروع ہوئے تو عوام اور انتظامیہ قریب آئے۔ کام تو سنا تھا مگر نہ تھا۔



ایک دوسرے کی زبان سیکھی۔ ربط بڑھا شکوک دور ہوئے پہلا معنی یہ تھا کہ آپ بات کرتے ہو تو ڈیرہ سے ہماری بھی سنو! راشن کپڑا مزدوری جو کچھ دینا ہے ہمیں ہمارے ہاتھ میں دو! ہمیں تو لوٹ لیا برباد کر دیا اگر ڈیرہ سامنے آگیا تو خاموشی۔ دیر تو ضرور لگے گی۔ یہ زنجیریں تو ٹوٹتی ہیں اور ٹوٹیں گی۔

ایک عجیب بات کہ بیداری آتی ہے تو تیزی سے آتی ہے آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ سوتے آدمی کو دھکا دے کر اٹھائیں تو اونگھ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ہمارے مری دوست جو سڑک پر کام کرتے ہیں شکوہ کرنے لگے "یہ شامیل نے کس کے لئے لگ رہے ہیں باتیں کن سے ہو رہی ہیں۔ ڈیرہ رو سے ہی نا! ہمیں کون پوچھتا ہے؟" رقابت تو ہوئی تھی۔ جواب دینا مشکل۔ سوچ کر بولے "ایک دن میں تو دنیا نہیں بدلتی۔ کام آہستہ آہستہ ہی ہوتے ہیں چلے ربط تو قائم ہوا۔ چاہے۔ ڈیریوں ہی سے۔"

دوسرے دن جبرگہ منعقد ہوا اور متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس کا مفہوم یہ تھا پاکستان ہم سب کا ملک ہے اور اس کی ترقی کے لئے سب سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ افغانستان کے رد کے لئے مذمت کی گئی۔ ترقی کی رفتار کی قرارداد رکھنے کے لئے زور دیا گیا۔ عوامی حکومت اور عام طور سے وزیراعظم کی ذاتی کوششوں کو جو وہ ترقی کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ سراہا گیا۔

آپ کہتے ہیں کہ اس فرسودہ نظام کو ہلٹے ہٹانے دیر لگے گی۔ جی ہاں دیر تو لگے گی ایک نظام چلے کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو اسے ایک دم نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر آپ بٹائیں گے تو پھر وہی خلاؤالی بات یعنی (VACUUM) پیدا ہو جاتا ہے جو نبات خود مغرب نے اسے تبدیل ہی کیا جاسکتا ہے تبدیلی میں دیر تو لازمی ہے مگر شروع تو ہو گئی ہے کل ایک اہلکار بہت ناراض تھے "کیا ہو جناب؟" "تیرا مرض کس جذب کوئی آتا ہے کپڑے دو کوئی کہتا ہے راشن کا نظام درست نہیں۔ کوئی کہتا ہے فلاں کانواں منظور کیلئے مجھے کیوں نہیں حکومت سب کو دیتی ہے آپ لوگ کوتاہی کرتے ہیں، میں تو تنگ آگیا ہوں۔" اس میں تنگ ہونے کی کیا بات ہے؟ مناسب کس کس کو سمجھائیں۔ جب ذہن کر باہر نکلنے کی دھمکی دی تو کہنے لگا "اچھا مت سنو۔ مجھ کو صاحب جب سے گا تو ہم اس کو کہیں گے۔"





کوه‌های پست‌زمینی‌های جزایر تبت



## گوہلو میں عید

گوہلو میں گرمی زیادہ نہیں پڑتی۔ اس لئے کام کے باوجود روزہ رکھنا مشکل نہیں۔ رمضان شریف میں کافی کوشش کی گئی کہ اپنے دوستوں کو اور پھر جو نظر بند ہیں انہیں بھی نماز پڑھنا سکھایا جائے اس نیک کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ روزہ یہاں لوگ کم ہی رکھتے ہیں مگر اچھی خاصی تعداد نے ہمت کر لی۔ ایک بات عجیب ہے کہ بیشتر کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے۔ اللہ کو فرو یاد کرتے ہیں۔

سترہ کتوبر کو سب اس امید میں تھے کہ عید شاید اٹھارہ کو ہو جائے۔ مگر شام کو روایت ہلاں کیٹی کا اعلان۔ ریڈیو پر سنا کہ عید انیس کو ہوگی۔ ویسے عید کے سارے انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے کہ نماز فجر اور غیر فجر ایک ہی ساتھ پڑھیں۔ نظر بندوں کو ساتھ ملایا جائے گا اور کھانا بھی ایک ہی جگہ کھایا جائے گا۔

اٹھارہ کتوبر کو چونکہ عید نہیں تھی اس لئے ہم لوگ کام میں مشغول ہو گئے۔ یکایک پتہ چکر لوگوں کی خاصی تعداد نے عید منسوب ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

”ان لوگوں نے ابھی ابھی چاند دیکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بازار میں بھی کھلے بندوں کا ہر ہتھ دھیر



کو سہی کا چاند نظر آتے آج ہم سنا نہ دیکھا۔ جب ہمارے ایک افسر نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ آج کی عید ہے۔ مولوی صاحب سے استفسار کیا گیا کہ جناب کیا آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ آج کی عید ہے؟

”مجھے فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی میں نے یہ کہہ لیا کہ آج کی عید ہے۔“

”لوگ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے آج عید منانے کی اجازت دی ہے۔“

”مطلب یہ ہوا کہ آپ نے عید منانے کی اجازت دی ہے۔ کیا آپ اس بارے میں کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں؟“ صاحبِ بابا نے یہ کہہ کر ایک نوجوان نے کہا چاند نظر آگیا، میں نے بھی دیکھا ہے، اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ بھی دیکھ لیں میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ اس معاملے میں مسئلہ یہ ہے کہ روزے پانچ دیکھ کر شروع کیے جاتے ہیں اور چاند ہی نظر آنے پر اختتام پر پہنچتے ہیں۔ اب چونکہ چاند نظر آگیا ہے تو افطار لازم

کر سکتے ہیں۔ یا فتوے دے سکتے ہیں۔“ مولوی صاحب کچھ سوچ کر بولے کہ ”جناب عید منانے کے بارے میں تو میں کوئی فتویٰ نہیں دے سکتا کیونکہ زوالِ کادقت شروع ہو گیا ہے اور نماز بہر حال کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ اب روزہ رکھنا جائز نہیں۔“

”مولوی صاحب بات دراصل یہ ہے کہ افطار میں صرف چار گھنٹے باقی رہ گئے ہیں اور ایسی حالت میں روزہ توڑنا درست نہیں لگتا۔“

مولوی صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر سوچ کر بولے ”صاحب جو آپ کی مرضی لیکن یہ تو دین کی بات ہے اور مسئلہ صاف ہے۔ پانچ نظر آگیا۔ لہذا اب روزہ رکھنا جائز نہیں۔“

اب جس نے چاند دیکھا تھا اسے طلب کیا گیا۔ چاند دیکھنے والا ایک سگنل مین تھا۔ سگنل مین ریڈیو کے ایریل کو ٹھیک کر رہا تھا۔ اُس کی نظر چاند پر پڑ گئی، اُس نے اپنے ساتھیوں کو دکھایا اور جو آس پاس لوگ تھے انہیں بھی۔

”آپ نے کہا کہ چاند نظر آیا اور آج کی عید ہے۔“

”صاحب میں نے تو چاند دیکھا تھا یہ نہیں کہا تھا کہ آج عید ہے۔“

”پہلی بات تو آپ نے چاند دیکھا کیوں؟ اگر دیکھا بھی تو ہماری اجازت کے بغیر دوسروں کو کیوں دکھایا؟  
”جناب میں نے تو نہیں دیکھا، وہ تو نظر آگیا۔ یہ ضرور غلطی ہو گئی کہ بغیر آپ کی اجازت کے

دوسروں کو دکھایا۔“

”اب غلطی ہو گئی ہے تو علو ہمیں بھی چاند دکھاؤ۔“

افسر صاحبان مکان کی چھت پر چڑھے تو معلوم ہوتا تھا کہ سگنل مین نے چاند دکھانے کا پورا پورا بندوبست کیا ہوا تھا۔ چھت پر ایک طرف دو درین رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کنارے پر دو شانہ کاٹ کریج میں ایک نشان لگایا ہوا تھا۔ نشان کو چھت کے سئلے سے ملا کر مکمل شست لگائی گئی تھی۔ افسر صاحبان نے پہلے تو بغیر دو درین کے چاند کو دیکھا مگر یقین نہ آیا پھر دو درین سے دیکھا تو چاند صاف نظر آ رہا تھا۔ مولوی صاحب خاموش کھڑے تھے۔ آخر میں یہ طپا کہ نماز اور خطبہ تو بہ حال ہو نہیں سکتا اب رہ گیا سوال روزے کا۔ مولوی صاحب اس پر مفسر کہ چاند دیکھنے کے بعد اگر کسی نے روزہ رکھا تو یہ حرام ہو گا۔ دوسرے مولوی صاحبان بلائے گئے ہر ایک کی رائے مختلف۔ روزے کا مسئلہ نیت پر چھوڑ دیا جائے اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے وہ نیت کو دیکھتا ہے۔ نیت صاحب اپنی جگہ پر! یہ تو دینی احکام ہیں مسئلہ صاف ہے چاند دیکھ لیا روزہ توڑنا لازم۔

اچھا آپ اتنے مصر ہیں تو دلیل پیش کریں۔“

کوہلو میں مسئلے مسائل کی تندیں کہاں، مولوی صاحب بڑی میر بعد اس پر راضی ہوئے کہ چلے ہر ایک کا گناہ ثواب اس کے ساتھ مگر میں تو یہ ہوں گا کہ اب روزہ رکھنا جائز نہیں۔ بہر حال یہ طپا کہ عید کی نماز کل صبح ہوئی۔

مری قبائل کی جہاں اور روایات ہیں وہاں ایک خاص روایت یہ بھی ہے کہ ہر ایک وڈیرہ عموماً اپنے فسر یا خاندان کے ساتھ ایک مولوی ضرور رکھتا ہے۔ یہ مولوی صاحبان اکثر پٹھان یا ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ مری مولوی اکثر کم ہی نظر آتے ہیں۔ آج کل کافی لوگ حیم یا خان یا بھاولپور کے مدرسوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ یکن تعلیم یافتہ مری مولوی صاحبان غنہ بدوشوں کے ساتھ پھرنے کو ناپسند کرتے

ہیں اور عام طور سے مسجدوں کو آباد کر کے وہاں درس دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس قسم کے کئی مولوی صاحبان سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ماشاء اللہ کافی عالم لگتے تھے اور سب سے بڑی بات مشنریوں کی طرح اس بات پر آمادہ نظر آتے تھے کہ جہالت کو ختم کر کے رہیں گے اور قرآنی تعلیم کو جہاں تک ممکن ہو اچھیلانیں گے اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب کرے آمین۔ ان مولوی صاحبان کی ہم نے ہر طرح سے مدد کرنا چاہی مگر ان لوگوں نے یہ کہہ کر مال دیا کہ "ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔ اگر آپ لوگوں سے ہم نے مدد لی تو ہمارا یہاں رہنا دو بھر ہو جائے گا۔ اگر آپ امداد اس طرح سے کر سکیں کہ دوسروں کو پتہ نہ چل سکے تو بسم اللہ کون ایرا سو گا کہ یہ نیک کام میں اتھنہ بناتا۔"

دوسرے وہ مولوی صاحبان ہیں جو کہ مشہور مقامات پر رہتے ہیں جیسے: لاہور، میوند، وغیرہ یہاں تو ہر طریقے سے مدد کی جاسکتی ہے اور کچلے بندوں مدد قبول کرتے ہیں۔ ہاں تو ذکر یہ مولوی صاحب کاہور تھا جو کہ قبائلیوں کے ہمراہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہتے ہیں۔ نظر بندوں کے ساتھ ایسے تین مولوی صاحبان ہیں۔ دو ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک پٹھان جو دکن کے رہنے والے ہیں جہاں تک دکن والے مولوی صاحب کا تعلق ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ خیرات لینے ہر دوسرے یا تیسرے مہینے غلطی کا چکر لگاتے ہیں اور قبائلیوں سے خیرات لے جاتے ہیں۔ اکثر نماز جنازہ پڑھانے کے سلسلے میں بھی مدد ہو جاتی ہے اگر کسی موت واقع ہو جائے تو پھر وہاں سے دو یا تین دنے خیرات کے مل جاتے ہیں یہ مولوی صاحب ایک چھوٹی سی زیارت کے مجاور بھی ہیں۔ لوگ وہاں منتیں مانگنے بھی آتے ہیں۔ پھر تعویذ اور ٹہنی کرنے سے بھی آمدنی ہو جاتی ہے بدی کرنے سے یہ مراد ہے کہ کسی کے اوپر دم کر دیا جاتا ہے کہ تمہیں گولی نہیں لگے گی اگر لگے گی بھی تو مرو گے نہیں اور اگر مر بھی گئے تو میرے جنت میں جاؤ گے۔"

ڈیرہ غازیخان کے مولوی صاحبان میں سے ایک تو پولیس کی نوکری کر چکے ہیں اور دوسرے نیشنل فائٹ حوالدار ہیں۔ ان مولوی صاحبان کے لئے سب سے زیادہ سہولت یہ ہے کہ یہ لوگ اردو اور بلوچی خوب والی سے بولتے ہیں لہذا انہیں ترجمان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس لئے ان لوگوں کی عزت میں کافی اضافہ ہوا ہے پہلے تو ان کو کوٹلا مہابانا تھا جو کہ عام رواج ہے مگر جوں جوں دن گزرتے گئے اور یہ لوگ نظر بندوں کی دادرس اور پرک

پہنچتے تو پھر یہ مولوی بنے اور آج انہیں مولوی صاحب کہا جاتا ہے۔ یہ مولوی صاحبان قبائلوں کے ساتھ رہتے ہیں، اذان پانچوں وقت کی دے لیتے ہیں، ماشاء اللہ نماز پڑھا بھی آتی ہے کہتے ہیں نمازِ جازہ بھی پڑھا سکتے ہیں، مگر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ ان لوگوں کی گزراوقات اچھی نامی ہو جاتی ہے۔

عید کا اجتماع ہوا۔ نظر بند ایک طرف اور باقی دوسری طرف۔ عید کے دن یہ بات دل کو نہ لگی، قصداً ہم فوجی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے، نماز ختم ہوئی۔ سب گئے ملنا شروع کیا یہاں ایک رواج ہے کہ عید ملنے کے بعد عید ملنے والا کہتا ہے حق بخشا، پھر دوسرا بھی یہی جواب دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ جو بھی غلطیاں ہم سے سرزد ہوئیں معاف کر دو۔ بڑی بات ہے، اس طرح حق بخشا، کر سب پھر سے آپس میں بھائی بھائی اور دشمنی فراموش کر دی جاتی ہے۔

یہ ایک نیک شگون تھا۔ عید کے ایک ہفتے بعد ہی عام معافی کے تحت سب نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا۔









میرے بہت سارے دوست کو انگریزوں سے



## عام معافی

”نفس اور انتقام“ انسانی فطرت ہے اس کی نئی متبر اور تحمل ہے۔ فطری مادوں کو نابوس رکھنا ایک خوبی ہوتی ہے۔ خوبی ہی کیا ہوگی اگر ہر ایک شخص اس کا مالک ہو اچھے سے، چھے انسان میں بھی کوئی نہ کوئی خافی ضرور ہوتی ہے۔ ورنہ فرشتہ بننا آسان ہو جائے اور دنیا کی خرابیاں کسی حد تک دور ہو جائیں، نفس کسی حد تک جائز بلکہ یوں بھی کہ برداشت کی جا سکتی ہے۔ انتقام بھی چلے اعتدال تک درست۔ جی تو نہیں ماننا مگر مان لیتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے نفس اعتدال شامل کر لیا ہے۔ لیکن تب ان فطری عادات کا اثر گناہگار اور بے گناہوں پر کیاں پڑے تو پھر آپ ہی جواب دیجئے۔ آخر حقوق بھی تو کوئی چیز ہوتے ہیں۔

چلئے حقوق ہی کی کچھ بات ہو جائے۔ ”حقوق النفس“ یعنی انسان کے اپنے نفس کے کچھ حقوق ہوتے ہیں مگر اس حد تک۔ ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ لیکن اگر تجاوز کیا گیا تو بات منفر ہوتی ہے مثال کے طور پر آپ ایک یا دو وقت تو بھیجے رہ کر اپنا کھانا دوسروں کو دے سکتے ہیں مگر ہمیشہ تو ایسا نہیں کر سکتے مگر اس کا سب سے بہتر امتزاج یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اتنا ہی کھانا کھائیں جتنا آپ کو ضرورت ہے باقی دوسری حاجت مندوں کو دے دیں۔ یہ بھی آج کل کے زمانے میں مشکل کام ہے، نفس تو بہر حال نفس ہے۔ پہلے میں۔ بعد میں کوئی



اور میں ہے کہ ختم ہونے پر ہی نہیں آتا "بڑے مودی کو مارا نفس آمار کو گومارا" آگے بڑھیے تو حقوق العباد آتے ہیں یعنی بندوں کا بندوں پر حق ان حقوق کو توڑ کر ہی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس حق تلفی کو تو خدا بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جب تک کہ جس کے ساتھ حق تلفی کی گئی ہو وہ معاف نہ کر دے۔

حقوق اللہ "تو خیر سب ہی جانتے ہیں اور اس کو اس طرح کہہ کر مال دیا جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے اگر آپ کے ساتھ کسی نے زیادتی کی ہو تو اس کو معاف کرنا ذرا محال ہو جائے۔ زیادتی دیدہ و دانستہ یا کبھی غلط فہمی کی بنا پر ہو سکتی ہے اس کا تجزیہ ضروری ہے مگر تجزیہ ہو کیجیے۔ جذبات پر قابو رکھیں اور سوچیں۔ جناب جذبات ہی کیا ہوئے جو قابو میں آسکیں۔ آسکتے ہیں۔ ذرا ضد اور انتقام کو ایک طرف کر دیں۔

کیسے کر دیں۔ کیسے کر دیں یہ تو انسانی فطرت ہے۔ فطرت تو ہے مگر حقوق جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی تو کوئی چیز ہیں۔ ارے صاحب کہاں کی اور کب کی بات کرتے ہو۔ جناب حال ہی کی بات ہو رہی ہے دنیا کے ماہرین نفسیات بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ اگر ذہنی کوفت اور بیماریوں سے بچنا ہے تو خدا کا سہارا ڈھونڈو۔ جو لوگ خدا ترس ہیں ان کو ایمان رکھتے ہیں تو یہ بیماریاں ان کے پاس بھینکتی تک نہیں۔ یہی حال تو میں کلمہ قوموں کو بھی تو بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں بھائی پھر فلسفے پر آگئے کہنا کیا چاہتے ہو۔

اکثر شام کو پہلے ہوتے نظر بندوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ میں تو اپنے ہی چاہے انہوں نے زیادتیاں ہی کی ہیں۔ آدمیوں کو مار رہے ان پر فائرنگ کی ہے مگر اب بات دوسری ہے۔ پناہ پھر پناہ ہوتی ہے۔ بدلہ لینے یا دینے والا تو کوئی اور ہی ہے۔ انسان کا اگر بس چلے تو خدا اختلاف ہو تو رزق بند کر دے وہ تو کیسے خیریت ہوئی کہ موت و حیات اور تقدیر خداوند تعالیٰ نے اپنے ذمے رکھی ہے۔ اگر وہ لینا چاہے تو کسی کا زور نہیں چل سکتا اور اگر دینا چاہے تو کسی کی مجال نہیں کہ دخل اندازی کر سکے۔ "بھٹو صاحب تو ہم لوگوں کو معاف کر گئے آپ ہیں کب چھوڑ رہے ہیں کہ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔

مری حال ہمیشہ صحیح اور تیز ہوتا ہے۔ اب پتہ نہیں یہ خبر کہاں تک درست تھی۔ بہر حال اس میں توبہ بہت حقیقت ضرور ہوگی۔ جہاں اتنا ممبر کیا تھوڑا اور سہی۔ کاغذات تیار کرتے ہوئے بھی دیر ہو ہی جاتی ہے۔ ایک طرف نظر بندوں کا یہ حال تھا تو دوسری جانب اسی علاقے اور اطراف کے کچھ پڑھے لکھے قبائلوں

اور چند مہانوں کی جو رائے تھی۔ ان کی ایک جھلک آپ بھی دیکھ لیں۔

”یہ لوگ تھوڑے دنوں بعد ہی حرکت کریں گے۔ تازہ اپنے آپ کو دہرائی ہے انگریزوں کے زمانے میں بھی ہی ہوتا آیا ہے۔“

جناب وہ تو ان لوگوں کو ابھی طرح سمجھتے تھے اور علاج بھی خوب کرتے تھے، آپ کو نہالاں کے والد کا قلم معلوم ہے یہیں کوہلو میں ایک گورنمنٹ ہوتی تھی وہ گشت کر کے مع اپنے کمانڈنگ آفیسر کے ”بزنس“ سے واپس آرہی تھی۔ نہالاں کے والد نے کچھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان پر فائر کھولا۔ اس حادثے میں کمانڈنگ آفیسر مارا گیا انہوں نے اس کے باپ کو گرفتار کیا ویسے بھی وہ اس علاقے کا وڈیرہ تھا۔ دس اور آدمی اس کے ساتھ پکڑے۔ کوہلو کی آبادی کو اکٹھا کیا۔ ان سب کو توپ کے دانے کے آگے باندھا اور اڑا دیا۔ مجال ہے اس کے بعد سے یہاں کوئی اس قسم کی واردات ہو تو جائے۔“

”اب سب کو معلوم ہے کہ کون کون تخریبی کارروائیوں میں ملوث تھے یہ بھی معلوم ہے کہ کس کس نے کہاں فار کیا کہاں گوبیں چلائی اور جانی نقصان کیے۔ اب اور کیا پائیے۔ اس کے برخلاف آپ لوگ ان کے جنازے بڑھتے ہیں۔ یہاں کا علاج کیا اور کئے ہیں اس کا دوسرا اثر یہ ہو گا کہ یہ لوگ سمجھیں گے کہ بس کبیل ہے۔ دوبارہ پھر سے کام شروع۔ معافی تو مل ہی جاتی ہے۔ مان لیا سب ان کارروائیوں میں شامل نہ تھے بہر حال جن کے خلاف شہادتیں موجود ہیں اور کہے کم ان فدیوں کو تو نہ چھوڑا جائے جو اس میں شامل تھے۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ مہان آئے ہیں۔ نظر بندی کیا ہے مہان خانہ کھلا ہے ان کا کھانا چیک کیا جاتا ہے کوئی بیمار ہو تو ڈکٹر آئے پیچھے بھاگ ہے یہ بیوی بچوں کے لئے مفت راشن تقسیم ہو رہا ہے، بچہ یا کوئی عورت بیمار ہو تو ایکمبولنس اشمارہ اشمارہ میل جا رہی ہے۔ ٹی بی کے مریض ہیں تو سیلی کا پڑے کو مٹہ پہنچا جاتے ہیں۔“

”جانے دو ان باتوں کو اور کیا کہیں ہفتے میں ایک دفعہ گاڑیوں پر بٹھا کر انہیں اپنے بیوی بچوں سے ملانے لے جایا جاتا ہے کبھی یہ خاطر تواضع سنی ہے؟“

ہم باہر کھڑے سلسلہ کلام سنتے رہے۔ کوئی مشرقی پاکستان کا حوالہ دیتا کہ وہاں بھی عام معافی ہوئی تھی اس کا بیانیہ نکلا۔ کوئی میٹیا کی کہانی دہراتا تو کوئی افریقہ کی۔ اس محفل میں ہماری ایک یونٹ کے

کمانڈنگ آفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ کافی دیر تک خاموشی سے یہ باتیں سنتے رہے، آخر ان سے نہ رہ گیا اور ان کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی۔

”جناب نہالاں کے باپ کے ساتھ کیا ہوا تھا اور کس نے کیا تھا وہ امپیریسٹ اور یہ کالونی قحی ہم لوگ یہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے بھائی ہیں اور پاکستان کے شہری۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر اس کو اس طرح سے سرانجام دینا ضروری ہے کہ ہم سے انہیں نفرت اور حقارت نہ پیدا ہو۔ فوج عوام کی ہوتی ہے۔ ہر وقت ان کے دل میں ہماری محبت قائم رہنی چاہیے۔ امپیریسٹ فوج سے ٹوکوں کو ڈماتا چاہیے اور یہی وجہ تھی کہ انگریز انہیں جان بوجھ کر اس طرح استعمال کرتے تھے نیشنل یا قومی اور امپیریسٹ فوج میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ انگریز کی ذہنیت سے کامیاب نہیں سکتی کیونکہ ان کے مقاصد اور ماحول ہی جدا تھے۔ یہ تو اپنے بھائی ہیں۔“

”بھائی تو خیر ٹھیک ہے“ کسی نے آہستہ سے کہا مطلب یہ کہ بات دل کو نہیں لگی۔

”انگریز کا یہاں کیا مقصد تھا۔ صرف یہ کہ امن قائم ہے اور وہ بھی کم سے کم خرچ میں۔ یہ علاقہ تو ہمیشہ سے غیر منافع بخش رہا ہے۔ یہاں اب تک کوئی ترقی نہیں ہوئی لہذا آمدنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پاکستان ہے پاکستان صرف کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ تک ہی محدود نہیں۔ پاکستان کو ملٹو میونڈ در کا ان بھی ہے۔ اگر پاکستان بننے کے بعد یہاں سڑکیں نہیں بنیں، اسکول نہیں کھلے، انڈسٹری قائم نہیں ہوئی۔ اختلافیہ جبرہ تقاضوں کے مرز پر قائم نہیں ہوئی تو کس کا قصور ہے اگر انگریز کا طریقہ استعمال کرنا ہے تو پھر امپیریسٹ ہی سہی یہاں لوگوں کے لئے پاکستان یا انگریز کی حکمرانی ایک ہی معنی رکھتی ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا مطلب اور مقصد تو یہی تھا کہ ہر ایک پاکستانی کو یکساں حقوق میسر ہوں۔ کسی کی بھی کسی کے اوپر بالادستی نہ ہو اور ہر ایک فرد اپنی استعداد کے مطابق پاکستان کی ترقی میں یکساں شریک ہو۔“

محفل میں خاموشی سی چھا گئی۔ یہ بڑی مشکل ہے دراصل جب کوئی آفیسر بات کرنی شروع کر دے تو بہت کم لوگ اس کے سامنے اختلاف کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ اختلاف تو ضرور کرنا چاہیے بشرطیکہ اگر کسی کو دل سے یقین ہو کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اگر ایسا نہیں ہو گا تو آپ کو کیسے پتہ لگے گا کہ دوسروں کے



جذبات کیا ہیں۔ مان لیں اگر ان کے جذبات آپ کے خیال میں درست نہیں تو پھر آپ ان کو راہِ راست پر کیسے لاسکتے ہیں۔ جب آپ کو پتہ ہی نہیں کہ دوسرے کیا سوچتے ہیں اور کیسے سوچتے ہیں۔ کرنل صاحب نے سوچتے ہوئے سلسلہ کلام شروع کیا۔

”ان حالات میں فوجی کارروائی مختلف ہوتی ہے فوجی عمل صرف پندرہ فی صدی اور رسول عمل پچاس فی صدی ہونا چاہیے۔ جس سے حالات قابو میں آسکیں یعنی زیادہ زور اس بات پر ہو کہ جو علاقے کی تکلیفات ہیں جیسے انتظامیہ کا نہ ہونا۔ اپنی امداد کا فقدان، سکول اور مشینیں ناپید وغیرہ کو پورا کیا جائے موجودہ گڑبڑ کو ایک ہی زاویے سے نہیں دیکھا جاسکتا اسے تو ہر زاویے سے دیکھنا ہوگا۔ اور اسی طرح اس کا سدباب کیا جاسکتا ہے۔ بات صرف موجودہ حالات ہی کی نہیں ہے آپ کو آئندہ کا بھی خیال رکھنا ہے مطلب یہ کہ کم سے کم بیس لاکھ کی سوچیں۔“

کسی نے بیچ میں لقمہ دیا ”یہ سب تو صحیح ہے فی الحال تو یہ دیکھیے کہ یہ حالات آخر کیوں پیدا ہوئے تاکہ ان کا سدباب جڑ سے کیا جائے۔“

بحثِ کارخ مڑ چکا تھا اور یہ سود مند معلوم ہوتی تھی! ایسی بحث میں حصہ لینے کی بجائے سننے میں زیادہ لطف آتا ہے اور انسان کافی حد تک سیکھتا ہے بشریکہ سیکھنا چاہے۔ کرنل صاحب نے اپنی رائے کی وضاحت کر رہے تھے۔ اب آپ یہاں کی تاریخ پر نظر ڈالیں سو یاد دو سال میں یہاں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے ان لوگوں کی زندگی پہاڑوں میں خانہ بدوشوں کی حالت میں گزری ہے انہیں حفاظت تو چاہیے حکومت ہے ہی نہیں تو حفاظت کی ہوئی۔ لہذا انہی حفاظت تو جزوی قبیلے ہی کی صورت میں ہوتی ہے اور جزوی قبیلے کا وڈیرہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جزوی قبیلے کے بعد پورے قبیلے کی حفاظت کا سوال تو یہ سب جزوی قبیلوں کے متحد ہونے پر ہے۔ لامحالہ سردار کا اثر اور اس کی طاقت لا محدود ہوتی ہے انگریز نے جان بوجھ کر سردار و وڈیروں کی اہمیت کو اور مضبوط کیا۔ تاکہ ایک قسم کا جسے ایک انگریزی میں ”ازم“ کہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو جائے وہی پرانی پالیسی ”رضہ ڈالو اور لڑاؤ“ اس طرح آپس کی اکھاڑ پھیل کو نہوا دینے کا طریقہ دھندلا۔ قبائلی تعصب کو بڑھایا۔ لوگ فرنگی کو بھول گئے اور آپس میں رسد کشی شروع ہو گئی اور انگریز کو عادل سمجھ بیٹھے۔ آخر حضرت ذوال



کافی مسئلہ تو فرنگی نے اپنی مرضی کے مطابق ہی دینا ہوتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد وہی مسئلہ قائم بلکہ انگریز نے جو انتظامیہ منظم کی تھی اسے بھی کمزور کر دیا۔ یعنی تھانے ختم کر دیے گئے۔ جب ایسے حالات ہوں تو بے ایمانی اور بدتر قسم کی انارکی (ANARCHY) جنم لیتی ہے۔ عام آدمی کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا۔ اب ترقی کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ انتظامیہ کو جدید تقاضوں کے مدنظر بحال کیا جائے تو یہ پورا ہے۔ دیر تو لگے گی بدتر آتا تو اپنا وقت لیتا ہے۔ ایک مہمان و ضاحک کرتے ہوئے بولے "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے ان حالات کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے جس کا تصور ذکر آپ نے کیلئے وہ یہ کہ آج کل کے زمانے میں ہر ایک شخص اپنے بنیادی حقوق چاہتا ہے اسے معاشی انصاف اور ضروریات زندگی کی بھی ضرورت ہے۔ اسے تعلیم اور انصاف کا بھی حق ہے۔ اگر ملک کا ایک حصہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے تو یہ ضروری ہے کہ اور حصوں کو محروم نہ رکھا جائے۔ ترقی کا انحصار ملک کے انفرادی حصوں پر نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی طور پر ہوتا ہے۔ صوبوں کا یہ فرق سرطان (CANCER) کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ملک میں جہاں ازم کی جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہو۔ مختلف زبانیں بولی جاتی ہوں۔ ذرائع آمد و رفت محدود ہوں۔ دروازے نہیں وہ ملک نو آبادی راہ ہو۔ افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیاء کے بیشتر ممالک میں یہی مرض نظر آئے گا سرطان کا مریض اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ کوئی معمولی سا مرض بھی آسانی کی کاری وارہ کر سکتا ہے۔ ایسے حالات میں تفریق۔ زبان کا مسئلہ قومیت کا مسئلہ یا کوئی بھی مسئلہ بڑھا چڑھا کر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ جو تمام ملک کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔"

ایک اور مہمان نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا جہاں تک عام معائنہ کا سوال ہے اس سے حالات سدھارنے میں مدد ملے گی۔ ان لوگوں کو ابھی تک آپ پر مکمل بھروسہ نہیں ہے۔ انہوں نے نوٹ بک انگریز کے وقت دیکھا تھا اب دیکھ رہے ہیں۔ ویسے اسکاوٹ یا میٹرو آتے جاتے رہے ہیں شروع شروع میں ڈیوٹ کے علاوہ آپ کے پاس اور کون آتا تھا آپ کو کیا معلوم۔ جب وڈیرہ کسی کا کام کرتا ہے تو وہ اپنی فیس اس سے دھرا لیتا ہے۔ یہ آپ کو جب پتہ چلا جب لوگوں سے رابطہ قائم ہوا۔ اب تو عورتیں بچے ہر قسم کے ہی لوگ اپنے مسائل لے کر آپ کے پاس آتے ہیں کوئی روائی۔

کے لئے اور کوئی صلاح مشورہ لینے کے لئے۔“

بحث میں کافی لطف آ رہا تھا مگر میرے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ادھر کا رخ کرنا پڑا۔ پتہ چلا کہ پرسوں نظر بندوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ ان لوگوں کے کاغذات تیار ہو چکے تھے سو چاکہ ایک دن باقی ہے پیشگی خبر ان کے خاندانوں کو بھی دے دی جائے۔ یہ لوگ مختلف جگہ آ کر اکٹھے ہو گئے تھے ان کی دیکھ بھال اور راشن مہیا کرنا ہماری ذمہ داری تھی۔

”دوسروں کے لئے کبھی وہ نہ پا ہو جو اپنے لئے نہیں چاہتے۔“ اس چھوٹی سی حدیث میں انسانی نفسیات کا ایک بڑا راز پنہاں ہے اگر اس پر سچی عمل پیرا ہوں تو دنیا کے دکھ درد مٹ جائیں۔ بات ہی دانا صاحب کی آگئی کہ روزہ نماز کلمہ سب ٹھیک ”خدا پر ایمان بھی ہے“ اگر ایمان ہو تو عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ جب بے بنیہ بنیے ہمارے ایک دوست کہنے لگے ”مجھے ان خاندانوں کو دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے مگر پھر ان کے مردوں کی زیادتیوں کا بھی خیال آتا ہے۔“

”انسانی احساسات تو سب کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ بچے پوچھتے ہیں کہ باپ کو کب رہا کرو گے۔ عورتیں چادر پھیلا کر اپنی اولاد اور آدمیوں کی رہائی کا سوال کرتی ہیں۔ انہیں جب تسلی دی جاتی ہے کہ صبر کرو کچھ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ آپ لوگ بھی تو ہمارے اپنے میں غلطی انعام سے ہو ہی جاتی ہے اس ذرا سی تسلی میں انہیں کتنا سکون ملتا ہے لوگوں کے پیروں کی رنگت بدل جاتی ہے۔“

”تسلی بھی کتنا بڑا سہارا ہوتا ہے۔“

محبت میں کشش ہو تو بے در غم سے حقارت جنم دیتی ہے۔ یہ سب ہی کو پتہ ہے مگر بات تو دی عمل کی ہے ذرا حوصلہ، تھوڑی ہمت اور درگزر ہی کی عادت یہ کیسے پیدا ہو؟ میں کو نہیں پہنچتی ہے۔

ہمارے دوست بولے آپ نے دیکھا کہ پہلے ہی فوجی گاڑیوں سے دور بھاگتے تھے اب ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اپنی نکایف بغیر کسی جمعہ کے بیان کرتے ہیں اور باتیں ان کی ختم نہیں ہوتیں۔ مگر رہائی کی خبر سن کر سب تکلیفیں ختم نیچے ہیں کہ ناچ رہے ہیں اور بڑوں کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا ”شکر“۔

”شکر ہی سارے درد کا دوا ہے۔“

خوشی تو ہیں بھی ہے کہ کسی بچے کو یہ بتانا کہ تیرا باپ کل آجائے گا۔ باپ ماں اور بیوی کی رائی کی خوشخبری دینا خاص طور سے جب انہیں دُوروں نے یہ یقین دلایا ہو کہ فوج سے کوئی زندہ سلامت نہیں آتا کتنی بڑی بات ہے۔

”یہ بھی ایک طرح کی خوش قسمتی ہے۔“

میں اکثر فراریوں سے یہ پوچھتا ہوں احسان جلتے کے لئے نہیں بس صرف معلومات کی خاطر پالوں کیسے انسانی نفسیات کو سمجھنے کے لئے کہ جن لوگوں پر تم گولیاں چلاتے رہے ہو آخر ان کی بھی اولاد ہوگی ان کے بھی اباں

جواب ملا ”ہماری بذمہ داری جہالت“ یہ میں ماننے کے لئے تیار نہیں یہ بتاؤ کہ تمہارے اوپر کس نے گولی چلائی۔ تاوقتیکہ تم نے فائر نہ کیا ہو۔ کہنے لگے کہ یہ تو ہم حلیفہ کہنے کو تیار ہیں۔ پھر میں نے سوال کیا کہ کبھی کسی عورت کو تنگ کیا تم کبھی نہیں کہیں نہیں“ فوجیوں نے ہمیشہ انہیں ماں اور بہنیں سمجھا ”پھر۔

”بس بذمہ داری ہیں غلط بتایا گیا تھا۔“

کسی بزرگ کا قول ہے سمجھوڑی وضاحت۔ ذرا صبر اور پھر درگزر۔ سارے جھگڑوں کا مادہ ہے۔







موسم و بی با ایک منظر



## مری ہسپتال کو ہلو

کوہلو کے مغرب میں تقریباً تیس میل کے فاصلے پر وادی دلتا واقع ہے اس سے تھوڑا سا شمال کی طرف جائیں تو کنل کا علاقہ آتا ہے جن دونوں حالات نہ خراب تھے ایک دفعہ گشت پر وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ صبح کا ذب کا وقت تھا۔ دور سے ایک مدہم روشنی نظر آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی طرف رخ کیا قریب پہنچ کر ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک دی زمین پر لیٹا ہے اور چار آدمیوں نے ہاتھ پیر کڑے ہوئے ہیں ایک معالج لود آگ میں گرم کرتا اور اس کی جانگوں میں داغ دیتا گرم لوبانگے سے ہلکا سا دھویں کا بھپکا اٹھتا اور گشت کے جلنے کی بو آتی، قریب مریض کی چیخ زنگل جاتی ہمارے ساتھ کچھ مری دوست بھی تھے ہم نے تھیسے پوچھا کہ آفراس آدمی کو کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے؟

ہمارے ساتھی نہیں کر بولے اس شخص کا علاج کیا جا رہا ہے۔ سزا نہیں دی جا رہی ہے؟

اچھا علاج کیا جا رہا ہے۔ بیماری بھی بہت مستحکم رہے گی اور پھر ان زخموں کا علاج بھی کرنا ہو گا۔

نہیں صاحب اس علاج سے فائدہ ہو گا یہ یہاں کا مانا ہوا معالج ہے؟

قریب پہنچ کر معالج صاحب سے استفسار کیا کہ جناب جس بیماری کا آپ علاج کر رہے ہیں ذرا ہمیں بھی تو

بتائیں یہ کیا مرض ہے؟ کہنے لگے: "معمولی سی بات ہے ایک دفعہ پہلے بھی میں نے اسے اسی طرح داغا تھا اس وقت یہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب پھر بیمار ہے" مسانت سے سوچتے ہوئے پھر بولے "دراصل اس کے پریکٹس میں کچھ فرق آگیا ہے اس وجہ سے چلنے میں درد ہوتا ہے اور کافی دنوں سے اسے بخار بھی ہے۔"

اتفاق سے ساتھ میں ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ ہم نے کہا کہ لگے ہاتھوں آپ بھی دیکھ لیں ڈاکٹر صاحب نے تسلی سے مریض کو اجمعی طرح دیکھا اس سے حال دریافت کیا۔ مریض ہڈیوں کا دھانچہ تھا۔ دائیں ٹانگ سوکھتی جا رہی تھی اور اسے ہلانے سے درد محسوس ہوتا تھا مریض کو چار پانچ ماہ سے متواتر بخار بھی بھی آ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "میرا خیال ہے کہ اسے کوھلوں کے جوڑ کی ٹی بی (HIP JOINT T.B) ہے اسے اے ایچ کیو کیمپ میں رکھ کر علاج کریں گے یا اور الائی ہسپتال میں داخل کر لیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب کچھ مسکرائے ان کی ہنسی میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ اس کے علاج میں مہینے لگیں گے۔ ہمارے پاس نہ دوائیاں ہیں اور نہ ہی باقی سہولتیں۔"

دل نہ مانا کہ مریض کو اس طرح جھوڑ دیا جاتے ڈاکٹر ذرا اہمیت گروایسی بھی کیا بات ہے۔ "پہلے ایسے چلتے ہیں" مگر مریض اور اس کے رشتہ دار کسی طرح ساتھ چلنے پر رضامند نہ تھے۔ ہمارے ایک مریض جو ساتھ تھے انہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لیجا کر کان میں کہنے لگے "یہ کبھی نہیں جائے گا دیر سے کا حکم ہے خبردار جو کیمپ میں گئے یا حکومت سے کوئی واسطہ رکھا۔ ہم نے بھی بہت کوشش کی مگر جواب نفی میں اس وقت زبردستی تو نہیں کر سکے تھے مگر آج کے۔" بات ہوتے تو زبردستی بھی کرنے۔ کیونکہ ہماری نیت سفاک تھی۔

اسی طرح زیارت مست توکل پر جانے کا اتفاق ہوا یہ زیارت بھی کوہلو سے اٹھارہ میل شمال مغرب میں ہے یہ زیارت بہت مانے ہوئے مری شاعر بزرگ کی ہے۔ مقبرہ بڑا شاندار ہے۔ پس میں پانی اور نمینس میں جو مزار کی ملکیت ہیں۔ صبح اور شام سنگر جتا ہے لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔ مزار کے قریب ایک بڑا تھار رکھا ہے جب کھانا تیار ہو جاتا ہے اس پر چوب لگائی جاتی ہے تو اس پس کے مسافر بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف کونے میں یک عورت بیٹھی تھی ساتھ میں کچھ رشتہ دار اس پرچہ آتے ہیں۔ نہیں زد دے تے ہیں۔ "تموڑی در میں زود دی نمود رہوئے ایک نیم نمودن قسم کی تہ نہ اور دوسرے شاید ان کے شاگرد نہاں نم

مولوی لوگوں کو ملنا کہہ کر پکارتے ہیں۔ اپنے حجرے سے نکلتے ہی دونوں نے نعرے لگائے۔ نعرہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شکر گردنے بال بکھیر لئے۔ اور جھومنا شروع کر دیا۔ ملا کے اٹھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔ یہ دونوں جان مرید کے قتلے قریب ہوتے جاتے تھے اتنا ہی شکر گرد کا جھومنا بڑھتا جاتا۔ اور ملا کا درد تیز اور زور و شور سے جاری رہتا۔ یقیناً ملا صاحب کلام مجید کی آیتیں نہیں پڑھ رہے تھے۔ جب شکر گرد کا جھومنا بظاہر بے قابو ہو گیا تو ملا نے آواز بلند اعلان کیا کہ جن عورت کو چھوڑ کر شکر گرد پر سوار ہو گیا ہے! سوال جواب شروع ہو گئے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ جن عورت کو چھوڑنے کے لئے تیار ہے مگر اس کے لئے کچھ قربانی دینی ہوگی۔ یہاں پر قربانی تو دونوں ہی کی تھی ہے اس قسم کی قربانی کے یہ غریب عادی ہوتے ہیں کیونکہ دلچسپ سے اور سوار کے کارندے آئے دن مال وصول کرتے رہتے ہیں مگر اب تو سب کی ہو گئی ہے۔ یہ تماشا آدھ گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ چار قبے نذر کرنے پڑے جناب آج کل ایک قبے کی قیمت ارٹھائی سو روپے ہے! اچھے سے اچھا ڈاکٹر بھی اتنی فیس نہیں لیتا۔ ویسے ملا صاحب اس عورت کا علاج پہلے بھی کر چکے تھے۔ اس وقت انہوں نے صرف ایک دوا لیا تھا۔ جکل گرائی بھی تو ہر جگہ ہے۔

یہاں پر ایک دوا بہت عام ہے آپ اسے ٹو لکھ کہہ سکتے ہیں مگر ہم دوائی ہی کہیں گے کیونکہ ہمارے مری کھائی اسے دوائی کہتے ہیں۔ ہم جب چھوٹے سے ہوتے تھے تو اس زلے میں ایک دوائی بہت عام تھی جو ہر مرض کی دوا سمجھی جاتی تھی جسے امرت دھا کہتے ہیں بس یہ علاج بھی یہاں کا امرت دھا ہے۔ پیٹ میں درد ہو جائے ہو: چوٹ لگے ہو: طبیعت مضمحل ہو: غرض کوئی بھی بیماری ہو مریض کو دینے کی کھال پہنا دی جاتی ہے بالکل ٹیٹرا سائیکلین (TETRA MYCIN) کی ذرے اس کا بھی بڑا (BROAD SPECTRUM) ہے یعنی دینے کو ذرا کیا اور کھال سالم آتی اگلی: ٹھون کی جگہ مریض کے ہاتھ اندر گرئیے۔ ورنہ کھال جسم پر اتار دی جس پر یہ سمجھ لیں کہ کھال کا جیکٹ پہنا دیا جاتا ہے یہ کھال مولودوں تک ایسے ہی پہنے رہنا ضروری ہے بعض معالج یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ جب تک کھال ستر نہ جائے اسے آنا قبل از وقت ہے۔ سی فائدہ ہوتا ہے: ہوتا تو ہوگا۔ جب ہی یہاں پر یہ دوائی کی جاتی ہے۔

مری ملا قے میں ادویات کی اقسام بہت ہیں مثلاً بھیر، بکری یا اونٹ کے درد کو سڑکریا خشک کر کے مختلف قسم کے پیپ بنائے جاتے ہیں۔ بعض جھاریوں کو کوٹ کر چوٹ پر باندھا جاتا ہے یا بال کران کا عرق



بھی پلا یا جاتے ہیں یاں پر ایک قسم کا پھوڑا ہوتا ہے جسے ڈاکٹری زبان میں CUTANEOUS LEISH MANIASIS کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جناب یہ نام مجھ میں نہیں آیا۔ ذرا عام فہم لفظ استعمال کریں کہنے لگے ALEPOO BUTTON نہیں سمجھے ORIENTAL SORE اب بھی پتے نہیں پڑا TRORKAL SORE۔ بھائی سیدی بات کہو پھوڑا ہے۔ ہے تو پھوڑا مگر قسم بھی تو کوئی چیز ہے اس کے مریض ہم بھی رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک ریت کی مکھی ہوتی ہے اور وہ بھی پھر سے چھوٹی اس کے کاٹنے سے یہ پھوڑا پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے ایک کی جگہ کئی بھی ہو سکتے ہیں اس پر کسی دوائی کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ تو اپنا وقت لیتا ہے۔ یعنی صرف چھ ماہ بعد میں اس کے انکسٹن اور مرعہ بھی آتے۔ یہ زندگی میں ایک دفعہ ضرور ہوتا ہے جب اس بیماری کے فوجی مریض زیادہ بڑھے تو شہر اور پڑت پہنچ گیا۔ ہدایت آمیز کہ ریت کی مکھی یہ جراثیم کتنے بلی گیدڑ اور چوہوں سے حاصل کرتی ہے۔ لہذا انہیں مارا جائے اور اس کام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جلتے۔ ہم نے کہا کہ جناب بیماری ہمیں منظور ہے مگر ان بانوروں کے پیچھے بھاگنا ہمارے بس کا کام نہیں ہے۔ ہاں تو ہم نے اپنے مری دوستوں سے رجوع کیا۔ انہوں نے معالجوں سے پوچھا۔ کہنے لگے یہ تو ہمارے یہاں کامیوہ ہے۔ یہ تحفہ تو ہر آنے والے کو نصیب ہوتا ہے یعنی جیسے بادام اور پستہ وغیرہ اچھا میوہ ہے اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو باندھیے اونٹ کی دم کی چربی مرکھ افادہ ہوگا۔ اس چربی کو حاصل کرنے کے لئے چھ ہزار کا اونٹ خرید جائے۔ مت خریدیے دوائی تو بتادی۔

تعویذ محند سے تو عام ہیں اگرچہ ڈاکٹروں اور ادویات کا فقدان ہے بہر حال علاج تو کرنا ہے ڈاکٹر اور ادویات آج کی ایجاد تو ہیں نہیں یہ چیزیں تو ازل سے ہی زندگی کے ساتھ ہیں۔ ہاں فرق صرف تعلیم اور ترقی کا ہے تو جناب جیسا ماحول ویسا ہی معالج اور اسی رنگ کی ادویات۔

ایک دفعہ ہم لورالائی سے آرہے تھے راستے میں ایک آدمی کو چادر اوڑھے ہوئے لیٹے دیکھا اس زمانے میں سڑک کے کنارے کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اور وہ بھی تو عمار کی ٹمٹ کے قریب جہاں اکثر حادثات رونما ہو چکے تھے گاڑیوں کو روکا اور دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ ہیں تو ہمارے مری دوست مگر حالت ناگفتہ بہ ہے۔ بولنے کی شش کرتے مگر بول نہ پاتے۔ بخار اور نقاہت سے برا حال تھا ساتھ ساتھ ہلکے۔ ہلکے ڈاکٹر صاحب بہت ہی عمدہ آدمی

ہیں۔ کام سے کبھی گریز نہیں کرتے مگر شکایت مفرد کرتے ہیں کہ نہ ادویات ہیں اور نہ سہولتیں، پھر آپ ٹی بی کا کیس لے آئے اسے تو آنٹوں کی ٹی بی ہے۔ ڈاکٹر گھبرائے کیوں ہو سب بندوبست ہو جائے گا۔ بھائی کو اس طرح ایریا رگڑتے دیکھا نہیں دیکھا جاتا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے اب آپ میری بھی تو کچھ مدد کیجئے بغیر ادویات کے میں بے بس ہوں کاش کہ مجھ میں روحانی طاقت ہوتی اور بغیر دوائی کے علاج کر سکتا۔ اس بیمار کو تو میں اوروں کے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ ان کے لئے علیحدہ جگہ ہونا ضروری ہے۔“

”ڈاکٹر سب ہو جائے گا۔ نیک کام میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ہمت برقرار رکھو۔“ وہ تو بے چیلے اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ دوائیاں اور خیمے ضروری ہیں۔ رات میس میں افسروں سے ذکر کیا، رات دو ایسا آئیں اور صبح تک خیمے نصب ہو گئے۔

تھوڑے دنوں بعد فوجی ہسپتال میں ڈاکٹروں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ سرجن، سٹینٹسٹ، ایڈیکل، سٹیلٹ بھی پہنچ گئے۔ حالات بھی کچھ بہتر ہونے شروع ہو گئے تھے اب جسے بھی جہاں کوئی مرضی ملتا ساتھ لے آتا۔ دوائیاں اس سے پہلے تو ان لوگوں نے استعمال کی نہیں تھی۔ دو ایک دن میں حالت بہتر ہوتی تو جانے کے لئے فصد شروع کر دیتے لاکھ سمجھایا جاتا کہ مرض ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ مگر مرض کا دل ہسپتال میں نہ لگتا۔ چارو ناچار جانے کی اجازت دی جاتی۔ ساتھ سیول ہسپتال تھا مگر وہاں بھی یہی عالم تھا۔ خیر اصرار تو داخلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر کچھ لوگ دوائیاں لینے مفرد آتے وہ بھی کوھلو کے گریو نواح سے۔

اپنے فوجی دستے جہاں بھی پہلے ہوئے تھے انہوں نے بھی علاج و عالج شروع کئے۔ مگر یہ وقت تو رہی عورتیں اور بچے تو بالکل ہی ہسپتال کے قریب نہیں بٹھکے تھے۔ اس اثنا میں ہمارے ڈاکٹر صاحبان نے بیاریوں کے متعلق امداد و شمار اکٹھے کرنے شروع کیے۔ بیچارے گشتی دستوں کے ساتھ جاتے لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے اور مہینوں کو دیکھتے۔ یہ کافی وقت طلب کام تھا جو امداد و شمار اس عرصے میں مہیا ہو سکے آپ بھی پڑھ لیں۔

دک، میس سے تیس فیصدی بچے پیدائش کے پندرہ دن کے اندر مر جاتے ہیں۔

اب، مختلف اقسام کی ٹی بی تیس فیصدی بیاریوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ مرض عورتوں اور بچوں میں بہت عام ہے۔  
ج، خون کی کمی اور غیر متوازی غذا کی بدولت اینیمیا اور ڈیفارمیشن (DEFORMATION) بہت

عام ہے۔ مریضوں میں ان کی تعداد تقریباً بیس فیصدی ہوگی۔

(د) ملیریا کے بیمار ہر موسم میں یہاں ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بیماریوں میں تین فیصدی ہے۔

(س) ذیابیطیس کے مریض بھی تقریباً بیماریوں میں ایک فیصدی ہوں گے۔

(م) سردیوں میں زیادہ تراموات نمونیا اور برانکائیٹس (BRONCHITIS) سے سوتی ہیں زیادہ تر بچے اور بوڑھے شکار ہوتے ہیں۔

(ن) آنکھوں کے امراض میں پانچ فیصدی لوگ مبتلا ہیں۔ رات کا اندھا پن عام ہے۔

(و) نسوانی امراض کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پورے علاقے میں نہ تو لیڈی ڈاکٹر ہے اور نہ ہی لیڈی ہیلتھ وز میٹر۔ اتنے میڈیکل کالج کھل گئے ہیں مگر یہاں کون آئے اپنے بھی پرانے بن گئے ہیں۔ کچھ نہیں تو چھٹیوں میں تو یہاں آ سکتے ہیں۔ کیا بات کہ ہے آپ نے بھی اچھیاں آرام کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا کام کرنے کے لیے۔ کام دنیا میں ویسے بھی اور کون سے کم ہیں۔

اں تو بات ہو رہی تھی کہ باوجود بیماریوں کے اور ڈاکٹر صاحبان موجود ہونے کے یہاں کے لوگ ہسپتال کیوں نہیں آتے لاکھ و ڈیرہ منع کرے۔ جان سب کو عزیز ہوتی ہے اور پھر اب تو حالات بھی بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ امام غزالیؒ کا قول یاد آیا کہ پہلے ”روح“ کو سمجھو پھر صورت اپنے آپ نکل آئے گی تو جناب روح کو ٹوٹنا شروع کیا۔ لوگوں سے بات۔ ڈاکٹر صاحبان سے مشورہ کیا۔ پھر ایک مشنری ڈاکٹر جنہوں نے افریقہ میں بڑا کام کیا تھا اور جن کی کتاب عرصہ ہوا پڑھی تھی۔ خیال آیا۔ پھر یہ کہ اس قسم کے مسئلہ کو یکطرفہ نظر سے تو حل نہیں کیا جاسکتا۔ لیٰ نظر سے دیکھنا ضروری ہے یعنی نفسیات، معاشی، روایتی اور سماجی وغیرہ وغیرہ۔

جہاں اس قسم کا ماساشرہ ہو یعنی گھومنے پھرنے والے لوگ جو کہ اپنے خاندانوں کے ساتھ پھرتے رہتے ہیں آپس کے ایک فرد کو لا کر اسپتال میں ڈال دیں جہاں اس بات کرنے والا کوئی نہیں، ایک اجنبی جگہ، صفائی کی پابندی وقت پر کھانا۔ ڈاکٹر صاحب چکر لگانے آتے ہیں۔ عجیب عجیب آلوں سے چیک کرتے ہیں۔ دوائی پلانے، سوئی لگانے کے لئے کیا وڈر سر پر کھڑا۔ ادھر مت میٹھو، ادھر مت تھو کو۔ رفع حاجت کے طریقے بھی جدا ملنے والے آتے ہیں تو وقت لپ۔ نہ بابا نا۔ یہ تو قید ہے۔ دوائی بیشک اپنا اثر دکھائے گی مگر ذہنی گرفت



بیماری سے اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ دودن کے بعد آدمی ویسے ہی بھاگنے کی سوچتا ہے، آپ کا ہسپتال ویسے ہی کیمپ کے اندر ہے اب اگر ایک بیمار لے گا تو اس کے رشتہ دار بھی ساتھ ہوں گے۔ کراچی یا لاہور تو نہیں ہے کہ بس پر بیٹھ کر بس میل سے بھی ملنے والے وقت پر آئیں اور چلے جائیں۔ یہاں تو جو آئے گا وہ ٹھہرے گا۔ بھئی۔ پیدل فاصلہ طے کرنا روز روز کی بات نہیں۔ اب عورتوں اور بچوں کو لے لیں عورت تو جناب اکیل رہ نہیں سکتی۔ اس کے ساتھ کوئی اس کا رشتہ دار بھی ہو گا یعنی کوئی مرد، پھر اس کے اپنے چھوٹے بچے بھی ہوں گے۔ مرد تو گھر پر بچوں کو نبھانے سے رہا۔ وہ تو شادی ہی اس لئے کرتا ہے کہ سارا کام عورت کرے۔ رہی بچوں کی بات تو ان کے ساتھ یہ مجبوریاں لاحق ہیں۔ ہسپتال چلانا ہے اور خدمتِ خلق کرنی ہے تو ان چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ ڈاکٹر اور دوائیاں بیکار رہیں مانتے تو دونوں اپنی جگہ خوش۔ ہمارا کام تو ہسپتال کھولنا تھا تو وہ کھول دیا، بورڈ بھی لگا دیا۔ سارے اختتام بھی کر دیے، اب لوگ نہیں آتے تو نہ آئیں آپ اپنی بات کرتے ہیں۔ جناب حکومت نے بہت سی جگہ کی بلڈنگیں بنائی ہیں، عملہ بھی ہے اور کیا کچھ نہیں پھر بھی متعلقہ افراد آرام سے بغیر کام کے بیٹھے رہیں۔ چلتا ہے، سب چلتا ہے جب لوگ تھوڑے پڑھ لکھ جائیں گے تو اپنے آپ آئیں گے۔ پھر تو عالم یہ ہو گا کہ اسمبلیوں میں شور ہو گا کہ کام ٹھیک سے نہیں چل رہا، اتنے دنوں کون انتظار کرے، کام کرنا ہے تو اب۔ اگر آپ غلصہ میں تو دیر کیلیں۔ زندگی اور موت کا کیا بھروسہ آج جی کل نہیں یا پھر آج سیان کل وہاں۔

ایک گھر کی تلاش شروع کی۔ قبضہ کرتے وقت تو کوئی دشواری نہ ہوئی، بلکہ بات جانے دیجے پکا دڑیسے کا گھر بیچ میں تین کمرے خالص بڑے اور چاروں طرف مین سامنے بڑا سا باغ جو کہ لوگ عموماً رفع حاجت کے لئے استعمال کرتے ہیں، مین کے ساتھ بے شک شہ دار ٹھہریں کوئی حرج نہیں، ملاقات جب مرنے آئے کرو سارا دن دروازے کھلے رہتے ہیں، مین میں پائے بنا چاہتے ہیں بنائیں، منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے سستی بنانی ہے بناؤ۔ راشن ہم بھی دیں گے، بن گیا ہمارا، حول کوئی قید نہیں سارے ہی دن ملنے والے آتے ہیں۔ اچھا ہے، اب وقت چلے بنتی رہتی ہے۔ کیا حرج ہے صفائی تو رکھنی ہوئی تو رکھیں۔ دن میں تین بار صفائی کرائیں، ملکر آدمیوں پر کوڑا کرکٹ ہٹانے کی پابندی فی الحال نہ رکھیں۔ جب لوگ مادی ہو جائیں تو بعد میں صبح پابندی



لگائی ہیں۔ تو پھر نام "مری ہسپتال" کیوں رکھا۔ اگر یہی نام رکھنا ہے تو ماحول بھی وہی رہنے دیں۔ آدمی باری تو رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے انداز میں رہنے بیٹھنے سے ختم ہو جاتی ہے۔ پہلے لوگ ٹی۔ بی کے ہسپتال کھولتے تھے اور اب بھی ہیں۔ یہی ٹی بی سینٹر ٹوریم کہلاتا ہے۔ مغربی مالک میں تو یہ سلسلہ ختم ہی ہو گیا کیوں لوگوں کو نفسیاتی طور پر بیمار کرتے ہو کر وہ علاج عام حالات میں۔

لوگوں کو نہانے کی عادت بھی ڈالیں۔ نہیں ابھی نہیں۔ ابھی غسل خانے بنائے، پانی کا بندوبست کئے۔ ایک آدھ دفعہ محبت سے التجا کریں اگر بچے میں ایک دفعہ بھی کوئی ہنسلے تو اچھا ہے مگر کوشش جاری رکھیے۔ کپڑے بنادیں کوئی مفاد نہ نہیں۔ وہ تو سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔ پھر کام آئے گا کوئی حرج نہیں ایک درجن ہنادیں آخر حکومت کپڑے بانٹنے ہی کے لئے دے رہی ہے۔ ہاں ذرا کپڑا دھونے کی عادت بھی ڈالیں۔ صابن اور تیل کی فراہمی ہے مہیا کر دو۔ یہ عادتیں تو ضروری ہیں۔ بیماری اپنے آپ کم ہونی شروع ہو جائے گی۔

جب مسئلے کی روح درست ہوئی تو جناب لوگ نے شروع ہوئے پہلے یوم کن مرنے تو یہاں کے تمام علاج آزما چکے تھے۔ یہ دائمی مرنے تھے "اب مرنے کو جانے کی ضرورت نہ تھی لوگ خود مارتے۔ سیوں اور لمبوں سے اسٹریچر بنایا اور اس پر مرنے بانڈھا ہوا۔

مرنے قریب انرگ ہسپتال میں پہنچا ساتھ میں ماں اور کچھ لوگ کہاں سے لئے ہوئے "بالا ذاکر سے یعنی مرنے پچیس میل دور سے ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ ان سب کی خوشامی ہے کہ میرے بیٹے کو ملے پلو تب یہاں پہنچے ہیں ڈاکٹر میرا بیٹا پانچ بجائے گا میرے کوئی اور والد نہیں یہ میری زندگی کا سہارا ہے۔

"مائی کتنے دن سے بیمار ہے۔"

"یہی ایک مہینے سے۔"

نساری دوایاں کریں مگر کوئی فائدہ نہیں کئی دنوں کی کھالیں پہنچا چکی ہوں کوئی بس نہیں چلتا ڈاکٹر صاحبان نے بڑی تسلی سے دیکھا۔ ایسے مرنے والے کے لئے ہمیشہ جو پہلے کارروائی کی جاتی ہے یعنی گلو کوڑکی بوتل لگا دی گئی۔ ہاں ڈاکٹر صاحب کیا تشخیص کیا "ڈاکٹر صاحب نے لمبا چوڑا سا کوئی ٹکینکی نام بیان کر دیا "بھائی اس معاملے میں ہم بالکل جاہل ہیں آپ سیدھی سادی زبان میں بتائیں۔



ایک مریض داخل ہوئی کمرے نیچے سے تمام گوشت اڑا ہوا۔ اب کیا کیا جائے۔ وارثوں کو کوئی اعتراض نہیں کہ ڈاکٹر اگر مرد ہیں۔ اس کی تو پلاسٹک سرجری کرنی ہوگی۔ اور خامی دیکھ لگی کوئی بات نہیں عزت کا سوال ہے کہ مریض ہسپتال سے بغیر علاج کے واپس نہیں جانا چاہیے۔ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ بھی نوالہ کا نام اور شروع کر دہ جن اور انسٹیٹسٹ مسکرائے اور بسم اللہ کر کے آپریشن تعمیر کا رخ کیا۔ تھوڑے دنوں بعد پٹی کوئی آپریشن پوری طرح تو کامیاب نہ تھا مگر کافی حصے پر جلد چڑھ گئی تھی۔

”بات یہ ہے کہ مریض کو بالکل ہلنا چاہیے۔ اب کوئی زناہ زس بھی نہیں غریب مریض کی کون مذکرے پیشاب کرنا ہے رفع حاجت کرنا ہے غریب عورت ہے کوئی وارث بھی یہ کام کرنے کو تیار نہیں ہمیں سے دانی لے آؤ۔ یہ کوئی یا پشاور تو نہیں ہے۔ یہاں آنے کو کون تیار ہو گا۔ کریں گے کوئی بندوبست۔ کوئی بھی عورت اس کام پر تیار نہ ہوگی۔ عورت اور لڑکی تو بہ تو بہ۔ پھر کچھ کیا۔ ایک اور آپریشن کے بعد مریض دمائیں دیتی اپنے گھر کو واپس ہوئی ہمارے سرجن نے ایک آپریشن تو کمال کا کیا۔ یعنی ان حالات میں اتنے بڑے آپریشن پر کون ہاتھ ڈالتا ہے۔ ایک عورت داخل ہوئی۔ چوٹ سے اس کے جگر پر زخم ہو گیا تھا سرجن ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ آپریشن کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اگر نہیں کرتے تو جان ویسے ہی جاتی ہے۔ اگر کرتے ہیں تو شاید ناکامیاب ہو۔ ویسے بھی اس قسم کے آپریشن اتنی فیصدی ناکام ہوتے ہیں“ ڈاکٹر شفا نے والا کوئی اور ہے تم نہیں۔ ٹھیک ہے بات دل کو لگی اور بسم اللہ کی پندرہ دن کے اندر اندر مریض نے اپنے وارثوں کے ساتھ گھر کا رخ کیا۔









دو بلوچ لڑکیاں سیوی اور جہاں بی

## ”ٹپے“

مری علاقے کی جھلک ہم نے مختلف زادیوں سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی، لسانی اور انتظامی امور کو زیر بحث لایا گیا۔ ہم اپنے محدود علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں۔ مگر شاہد ہے میں تو اس کا سوال کہ ہی پیدا ہوتا ہے۔ چلئے کچھ تو کوششیں ہوئیں۔ اب ذرا اپنا تجربہ ہو جائے بغیر اس کے بیان تشنہ رہتا ہے۔

میں ہوائی جہاز کے سفر سے ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ گھبرنے کی ایسی کیا بات ہے؟ مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ تجھے سب کچھ پتہ ہے مگر کیا کروں؟ بس گھبراتا ہوں۔ بطف بھی بڑا آتا ہے اور جب بھی موقع ملے اس کی سواری چھوڑی بھی نہیں جاتی۔ بڑی مفادات ہیں۔ اب کیا کیجئے یہ ہی حقیقت بھی ہے۔

جب سے بلوچستان آیا ہوں۔ ہوائی جہاز سے اتنے سفر کیے ہیں کہ حساب رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہاں اس کے بغیر گزارا بھی نہیں ہو سکتا۔ کوہلو سے کوٹہ جانا، ہوجیپ پر اگر آپ جائیں تو کم از کم دو دن لگتے ہیں۔ بیٹھے جہاز پر اور دو گھنٹے میں کوٹہ پہنچ گئے۔ کوہلو سے سبی جانا تو پہلے کوٹہ جانیے پھر وہاں سے سبی۔ مگر جہاز کی کیا بات ہے؟ ناک کی سیدھ پکڑی اور ایک گھنٹے میں سبی۔

جہاز پر بیٹھ بیٹھ کر راستے خوب یاد ہو گئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ہوا میں آپ راستہ بھول جائیے

تو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے پائلٹ ساتھ ہوتا ہے مگر اپنی جان بھی عزیز ہے جہاں اپنا مفاد شامل ہو تو ہوتا کچھ اور ہوتی ہے مفاد بھی ایسا ویسا نہیں۔ وہ بھی زندگی کا معاملہ ایک دفعہ جہاز پر بیٹھا۔ اور الائی جانا تھا۔ علاقہ میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور پائلٹ صاحب بھی نے اب راستہ بھول گئے۔ جب ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا اور راستہ نہ ملا۔ بھٹی نقشہ ساتھ نہیں تھا؛ نقشہ بھی ساتھ تھا۔ جہاز کا قلب نما بھی کام کر رہا تھا مگر ایسا بھی ہو جاتا ہے کیسے ہو جاتا ہے؛ اب ہوا ہٹا کیا کریں۔ نیچے ایک سرک نظر آئی۔ جہاز کا تیل بھی کم ہو رہا تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا "میں تو انفٹری والا ہوں اب پیدل چلنے والوں کا طریقہ استعمال کریں" کہنے لگے کہ کبھا نہیں "بھائی اللہ کا نام لو اور نیچے از جاؤ" سرک پتلی ضرور ہے۔ پوچھ لیتے ہیں کسی راہ گیر سے کہ لودا لابی کس سمت میں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا پتہ ملا کہ ہم لودا لابی سے صرف پچاس میل مختلف سمت میں پہنچ گئے ہیں۔

گرمیوں میں یہاں جہاز کا سفر کچھ حد تک خطرناک ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب پائلٹ خیا ہو۔ دھندلی ہو کہ کہ الامان الحیفظ کچھ نظری نہیں آتا۔ جنب تو جہاز چلاتے کیوں ہیں؛ کوئی بات تو ہوگی جو چلاتے ہیں۔ بیکار چلانے میں کیا مزہ آتا ہے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ پیش آیا کہ کوئٹہ جا۔ ضروری تھا جہاز پر بیٹھے اس جہاز میں صرف دو آدمی سہا سکتے تھے میں اور پائلٹ۔ وہ بھی تجربہ کار مجھے بھی یہاں کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ گرو اتنی تھی کہ سو گز بھی دیکھنا مشکل گرمیوں کی گڑ بھی خوب ہوتی ہے۔ آسمان تک پھیل جاتی ہے اور بیٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ ہوا چلے تو غبار بنے۔ اگر ہوا چلے گی تو غبار تھوڑی دیر کو بٹ جاتا ہے مگر تھوڑی دیر میں پھر سر پر سوار جہاز ہونہ پہنچا اس کے بعد اسے چاکر لے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ چاکرنگی کے آگے ترک کند آتا ہے پھر تھوڑی دور آگے چل کر سب کا میدان آتا ہے۔ چاکرنگی وہ جگہ ہے جہاں میر چاکرنگے ترکوں کا مقابلہ کیا تھا اور ترک کند پھونک فابن ہو گئے تھے میر چاکرنگی بان ان کی بیوی بی بی ہانی کی تجویز سے پکی تھی۔ اب چاکرنگی نظر آئے تو آدمی دیکھے۔ نیچے دیکھتے ہیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ اوپر نگاہ کی تو خاک رنگ کا آسمان۔ دائیں بائیں کی پہاڑیاں غائب۔ سامنے نظر دور دھائی تو گرو۔ تھوڑی دور چل کر ایک دم سے ایک بڑا پہاڑ نظر آیا فاصلہ بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ موٹر کار ہو تو آدمی روک کر کھڑا ہو جائے یا دائیں بائیں کاٹ کر پہاڑ سے نیچے کیا بات ہے۔ یعنی پہاڑ نہ ہو گیا جانور ہے کہ آپ اس سے نہیں بچ سکتے۔ جہاز دائیں کاٹیں یا بائیں۔ مگر ہے کسی اور پہاڑ سے بچا گیا

جناب اللہ کا نام لیا اور کٹا دیاں کیا کر دے راستہ یاد ہے اس وقت تو کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس پہاڑ کو عبور کروں و ماکریں کر کوئی اور پہاڑ نزدیک ہو۔ کیونکہ اسے عبور کرنے کے لئے اونچائی حاصل کرتے کرتے دو تین چکر لگنے ہوں گے۔ اتنا تو عمر بڑھانے اطمینان سے بات کر رہا ہے۔ آپ ہیں کہ گھبرائے جا رہے ہیں۔ ویسے تو ہمیشہ دیکھتے ہو کہ مرنا تو ایک دن ہے ہر موت سے کیا ڈنا، یہ کچھ ٹھیک ہے، اب میدان کی بات کرو، میدان کی بات۔ جتنی آتیں یا تھیں پڑھ لیں۔ بیگم نے قرآن کریم کی ایک آیت لکھ کر جیب میں لکھ دی تھی کہ جب سفر کرو ضرور پڑھ لیا کرو یہ آیت صفت نوحؑ اپنی کشتی پر طوفان سے بچنے کے لئے بیٹھے تو اس وقت انہوں نے پڑھی تھی ”بسم اللہ مجربھا و مرسلھا ان ربی الغفور الرحیم“ (اللہ کے نام سے ہے اس کا پہنا اور ٹھہرا، بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے) جلدی جلدی جیب ٹوٹی اور اس کا ورد شروع کر دیا اس واقعہ کو دو تین منٹ لگے ہوں گے مگر گھنٹوں گزر گئے۔ پہاڑ عبور ہوا تو کسی کا میدان، میدان کیا خاک نظر آتا اس وقت دُزین اور آسمان سبھی خالی میدان بنے ہوئے تھے۔ کوئٹہ چلتے ہیں بس سمت رکھ کر کوئٹہ کا رخ کیا اور چل لیے اب وہاں بھی تیز ہو گئی تھی ایک خوب ہے اس جہاز کی۔ اوپر جاتا ہے نیچے آتا ہے، اچھکولے کھا رہا ہے، مڑ چل رہا ہے۔ کوئی آدھا گھنٹہ اسی شکل میں گزر گیا مگر اب گرد کچھ کم ہو چکی تھی اور پہاڑیاں بھی صاف نظر آ رہی تھیں، اللہ اللہ کر کے مشکل دور ہوئی۔

اسی قسم کے اور بھی حادثات پیش آتے رہے مگر یہ بات نہ ہو تو پھر زندگی کیا۔ بات ڈراور گھبراہٹ کی تھی۔ یہ قدرتی بات ہے اپنا بچاؤ فطری چیز ہے۔ یہ تو صحیح ہے مگر مگر پھر کیا۔ بات یہ ہے کہ نماز پڑھتے ہو، پڑھتا ہوں۔ روزے رکھتے ہو، رکھتا ہوں اگر بھار نہ ہوں۔ حج کیا تو نہیں مگر کرنے کا ارادہ ہے، نمیزنا و ازدی کہ یہ ساری باتیں تو یہی مگر ہمیشہ سچ بھی بولتے ہو، جان دینی ہے اللہ کو منہ دکھانے، ہمیشہ توسع نہیں بولتے، غیبت کرتے ہو اکثر، یہی مشغلہ رہتا ہے دعوہ نعلتے ہو کوشش کرتا ہوں، نہیں بات سچی اور سیدھی کرو، اس کو کبھی اہمیت نہیں دی، اپنے منہ کو دوسرے کے فائدے نقصان پر ترجیح دیتے ہو۔ ظاہر ہے کہ آج کل کے زمانے میں کون دوسروں کا خیال کرتا ہے کیا فائدہ ایسے روزے نماز کا۔ واہ صاحب روزہ نماز اپنی جگہ دنیا اپنی جگہ، کیا جگہ تعین کی ہے صاف نکل گئے۔ اگر صاف بچے کی کوشش کرو گے تو یہی ہو گا جواب یک ہوتا رہا ہے۔ داتا گنج بخشؒ کی کتاب کشف المحجوب پڑھی، کچھ سیکھا بھی، یہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ نماز روزے سے پہلے یہ دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت



پر یقین بھی ہے یا نہیں 'ایمان کی اُجد ہے' ہے صاحبِ مَرَد ہے 'اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے' ہر بات جانتا ہے اور سُنا ہے جی القیوم ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا وہی رزاق ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے لینا چاہے کسی کا باپ اسے نہیں روک سکتا۔ دنیا کی کوئی چیز بغیر اس کے حکم کے نہیں ہل سکتی بس بس خداؤ تعالیٰ کی تعریف تو ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر سارے سندر سیامی ہو جائیں اور سارے درخت قلم پھر بھی بیان کرنا نا ممکن ہے۔ آدمی تو لکھے پڑھے ہو یہ بتاؤ پھر جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ غیبت کیوں کرتے ہو وعدہ کیوں نہیں نبھاتے انعام کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دوسروں کا بھی خیال رکھو! بولاب۔ جھوٹ بولتے ہو تو خدا سے تو نہیں ڈرتے ہو ہو دیلے ڈرتے ہو اپنا مفاد ہر حال میں پیارا ہے۔ جب ہی تو دوسرے کی گردن کاٹتے ہو اور غیبت کرتے ہو پھر کہتے ہو کہ خدا کو منہ دکھانا ہے ویسے گردن کاٹتے ہو جھوٹ بولتے ہو۔ غیبت کرتے ہوئے۔ خدا تو دیکھ رہا ہے تمہیں یقین نہیں کہ خدا دیکھ رہا ہے۔

تم کہہ رہے ہو کہ وہ ہی دینے والا ہے مگر دوسرے نہیں ہے۔ اگر دوسرے ہے تو چار سو بیسی کیوں کرتے ہو: بجا ختم سے دد کیوں نہیں رہتے۔ بات تو سچی ہے۔ نماز روزہ اسی ایمان کو پختہ کرنے کے لیے ہے۔ نماز پڑھو اس کے معنی پُر نور کیا جائے۔ مت غور کرو پھر گلہ کیوں نہ:

ذکرِ غور کرنے کا آگیا۔ ہمارے صاحبزادے ایک روز کہنے لگے کہ ابا! جکل مغربی ملک میں میڈیٹیشن (MEDITATION) کا بڑا کریز (CRAZE) ہے۔ لوگ ہیں کہ لوگ ایک دن رات مشق کرتے ہیں پیسے فرار کی راہ اختیار کی۔ یعنی شراب اور نشے کے دھڑی ہیں اس میں سکون نہ ملا تو میڈیٹیشن پر اتر آئے کہتے ہیں۔ اس سے دل کو سکون ملتا ہے۔ صاحبزادے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میڈیٹیشن پر اتر آئے کہتے ہیں اس سے دل کو سکون ملتا ہے۔ صاحبزادے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میڈیٹیشن تو مسلمان ہی کرتے تھے جسے مراقبہ کہتے ہیں۔ ابا مراقبہ تو صرف بزرگوں دین ہی کرتے تھے ہم لوگ کیسے کر سکتے ہیں! پھر سوچ کر بولے چلہ کھینچو! تو مراقبہ کی ہی ایک قسم ہے چلہ اگر آدمی غلط کھینچے تو پاگل ہو جاتا ہے! مذہب نہ ہوا ایک تماشہ ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بزرگوں دین کی باتیں سنتے ہیں اور شغل کرتے ہیں مگر ہم۔ جناب سب کی بات نہیں مت مراقبہ کرو! مت چلہ کھینچو! مگر خدا کو حاضر ناظر جانو! اس کی وحدانیت اور ربوبیت کو پہچانو! اس پر عمل کرو۔ یہ ہی تو سب سے مشکل کام ہے تو پھر گلہ کیوں کرتے ہو پھر سوچو جیسے 'دور رہتے ہیں۔ تمہارا حال ان سے بھی بدتر ہو گا۔ وہ کم سے کم دنیا دار تو ہیں جنہیں سب جانتے اور پہچانتے ہیں تم نہ دنیا دار

اور زندہ بیدار تو خواب ملاوٹ تو مل نہیں سکتی۔ زندگی نوکتابھی گزار دیتا ہے۔

ہم نے بزرگوں سے سنا ہے اور داتا صاحب کی کتاب میں پڑھا بھی ہے کہ خداوند تعالیٰ کی صفت پر جب غور کرو تو تین باتوں پر خاص توجہ دو یعنی اس کے جمال ”کمال“ اور ”طلال“ پر یعنی انگریزی میں ”Precision, Beauty Majesty“ تو بہت کچھ محفل بھی کیا یہ ذرا مشکل کام ہے۔ آپ بابا رمل کی بات کرتے ہیں اپنے پیشے کو لے لیجئے آپ نے بڑی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن جب بھی موقع ملتا اس پر عمل کہاں تک کیا کہہ دو یہ بھی مشکل تھا۔ ہاں تھا تو۔  
 اتنا اذہان ایمان کی۔ جب جو کچھ پڑھ لیا اس پر ایمان ہی نہیں کیا کہہ سکتے تھے کہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تو عمل کیا تھا؟  
 ذکر شروع کیا۔ بازار کے سفر کا درپہر سلسلہ کہاں پہنچا دیا۔ پیسے جہاز کی بات کر لیتے ہیں اکتے میں ڈر بھی لگتا ہے اور سواری بھی ٹوب کرتے ہیں یعنی جان پیاری بھی نہیں بانت جاتے بھی نہیں جہاز کا سفر بعض وقت بقول کھنسنے بہت ہی بوجھوتا ہے اور خاص طور پر نوبی پہاڑ۔ دو آدمی ہیں اڑے جارہے ہیں اگر انٹرکام (INTERCOM) خراب ہو تو آپس میں بات بھی نہیں کر سکتے۔ دھکے لگے کھم پڑھنا شروع کر دیا۔ نیچے دیکھا۔ گھبراہٹ ہوئی سکرین پی ٹرینا کر دی ایک دو منٹ کی بات نہیں کھنسنوں کی بات ہوتی ہے۔

کبھی بات تو یہ ہے کہ اتنا گن ہنگار ہوتے ہوئے خداوند تعالیٰ کے جمال کمال اور طلال کی بات کر رہا ہوں لوگوں نے تو اس پر طعن صرف کر دی ہیں۔ تو کیا بات کرے گا۔ کیا تیری سہنی اور کیا تیری ذات۔ بھائی سب ٹھیک ہے گناہ گنا کو کچھ کہنے کا حق بھی نہیں سن تو لیں۔

جہاز اڑا۔ آہستہ آہستہ اس نے ادنیٰ تا اصل کرنا شروع کی بسنے زبیرت کی پہاڑیاں ہیں۔ یہ پہاڑی سسٹے کا گارہ ہے۔ مشرق کی جانب سے سورج نکل رہا ہے۔ سورج کی کرنیں ان پہاڑیوں پر پڑتی ہیں۔ مختلف قسم کے رنگ بکھیرتی ہیں۔ کوئی پہاڑی سرخی مائل کوئی سرمئی، کئی کا ملا جلا رنگ۔ جیسے جیسے جہاز آگے چلتا جاتا ہے۔ رنگ بدلتے جاتے ہیں۔ تیر بھی ہے لٹاؤ بھی اور کیا یہ رنگ بکھیر رہے ہیں ان پہاڑیوں پر سے مختلف اوقات اور مختلف موسم میں گزرا ہوں مگر ہر دفعہ ایک نیا لطف آیا ہے اور ایک نیا سماں دیکھا ہے لوگ کہتے ہیں کہ ایک ہی چیز کو صبح اور شام دیکھے جاؤ تو طبیعت اکتا جاتی ہے۔ غور سے دیکھیں تو ہر لمحہ نیا ہے اور ہر صحت دلکش۔ موسم خراب بھی ہوا بدل بھی سامنے آئے مگر لطف اور دوا ہاں۔ آگے بڑھے تو زیارت کے پہاڑ یہاں جہاز وادی میں سے گزرتا ہے۔ ہرے درخت

ان پر سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں، سامنے کالے بادل، مختلف رنگ، ان کا تغار کبھی سورج چھپتا ہے تو سماں ہی بل جاتا ہے۔ کہاں یہ چیز آپ آرٹ گیلری یا سینما میں بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جن سے کہ طبیعت کھیری نہیں ہوتی۔ آپ سامنے دن جہاز کو چمک رہی لطف کم نہیں ہوتا۔ اپنی اپنی نظر سے چاہے جس زاویے سے دیکھیں، اس کا حسن تو ہر ایک کے لئے ہے۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق سیری کریں۔ نہ چاہیں تو آپ کی مرضی، پیچھے سگریٹیں اور گھنٹے گئیے گزاریے وقت جیسے بھی گزرتا ہے۔

سورج اور چڑھ رہا ہے۔ اپنے تعین شدہ راستے پر اگر آپ کا حساب صحیح ہے تو اس میں فرق نہیں آسکتا لوگ تو اس سے گھنٹوں کیا سیکنڈوں کا حساب رکھتے ہیں، جیسے سورج چڑھتا جاتا ہے۔ مختلف رنگ بکھرتے جاتے ہیں۔ لگائے آپ کیوئیٹر۔ اسے صاحب کیا بات کر رہے ہیں آپ تو کفر پر اتر آئے۔ کہاں خدا اور کہاں بندے کا عقلمگر لوگ کہتے ہیں۔ روسیوں نے جب پہلا راکٹ خلا میں چھوڑا تو خدو شہبیت جلسے میں نہ سمائے اور کہنے لگے ”ہم دیکھ رہے ہیں کہ آسمان پر بھی جاکر دیکھ لائے ہیں۔ وہاں کوئی خدا نہیں“ یا خدا کو آسمان میں تلاش کرتا ہے اور وہ بھی عقل کا تعین کیا ہوا آسمان۔ اس کی وسعت کو سمجھنے کے لئے قتل کہاں تک ساتھ دے گی۔ قتل تو خود محدود ہے خدا تو تیرے قریب ہے، آس پاس ہے ہر جگہ ہے۔ باتیں تو کچھ ٹھیک ہی کرتے ہو مگر عقل۔ اب جانے دیں ان باتوں کو کمزوری کا اعتراف تو کرتا ہوں۔

جہان سے نیچے دیکھا۔ پہریوں پر نظر پڑی۔ کب سے رہا پڑیں اور سیارہ قائم ہیں اور کب تک رہیں گئے ان میں کیا رد و بدل مودعا ہوا۔ کبھی یہاں سمندر ہوتا تھا۔ پھر جنگل کیوں کیوں ہی مخلوق یہاں رہی ہوں گی۔ فوسلز (FOSSILS) یعنی رکازات میں نے بھی کافی اٹھنے کیے ہیں۔ ایسے یہ سمجھ لیجئے کسی جانور یا پانی کی مخلوق کا دھما پڑ جو کسی دباؤ کے تحت پتھر میں جاتا ہے، یہ پتھر کے ڈھانچے لاکھوں کروڑوں سال پرانے ہوتے ہیں، ان فوسلز سے پتا لگتا ہے کہ کبھی یہاں ڈائنا سور (DIANASOUR) گھومتے پھرتے ہوئے۔ ڈائنا سور کروڑوں صدیوں پہلے ایک جانور ہوتا تھا جو کہ ہاتھی سے بڑا تھا اور جب یہ زمین زیادہ تر پانی سے ڈھکی ہوئی تھی چاروں طرف آتش فشاں بڑے تھے اس وقت چہل قدمی کرتا تھا۔ اس زمانے میں درخت بھی جوتے تھے۔ جن کی پتیوں سے پیٹ بھی بھر لیتا تھا، محقق کہتے ہیں کہ ان کی کچھ اقسام گوشت خور بھی ہوتی تھیں، تو گوشت بھی قدرت دوسرے جانوروں کا مہیا کرتی تھی۔ زمین

کی حالت بدل۔ یہ جانور اور درخت معدوم ہو گئے۔ کتابوں میں ہم نے بھی پڑھا ہے آپ کو یقین نہیں آتا تو خود پہلا آکر ان کے ڈھانچے دیکھ لیں جو پتھر بن گئے ہیں۔ کچھ ہڈیاں اور درخت کی شاخیں میرے پاس بھی پڑی ہیں۔ اگر پھر بھی یقین نہ آئے تو میں آپ کو حکم بتائے دیتا ہوں۔ کیا بات کر رہے ہیں الف سیلی کی کہاں کہنے بیٹھ گئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ لیکن اس بات کمال کی ہے اس نے ہر وقت کا تعین کیلئے اور اس وقت کے واسطے کاروبار چل رہا ہے اور پتہ رہے گا۔ ہر ایک سیکنڈ کا اسے علم ہے۔ کچھ فوراً کہاں تک کیجئے گا۔

جس زاویے سے دیکھئے ایک نیا پہلو نظر آتا ہے۔ کہنے کو پتھر ہیں مگر سائنسی نکتہ نگاہ سے دیکھئے کان میں کیا کیا اجزاء شامل ہے کب اور کیسے ان کی ترکیب ہوتی۔ لکھیے حساب کہ ایک سوئی کے برابر پتھر کے ٹکڑے میں کتنے مالیکیول (MOLECULE) اور ایٹم (ATOM) ہوں گے۔ کتنے ایکڑ ان 'پروٹون' چکر لگا رہے ہوں گے۔ ہمارا علم درست بھی ہے۔ یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے۔ مگر اندازہ تو لگا سکتے ہیں۔ یہ ایکڑ ان 'پروٹون' اور نیوٹرون بھی تو ایک خاص حدود میں چکر لگاتے ہیں۔

بات آگئی جلال کی کیا اس کی حکومت ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک ہے گی۔ وقت اور فاصلے بمعنی لامحدود اور لامتناہی ہر ایک بندش سے آزاد۔ علم اور عقل کی بلندی سے بالاتر۔ آپ ایک جہاز میں سفر کر رہے ہیں نیچے نظر جاتی ہے تو پہاڑ بھی پہاڑ نظر آتے ہیں۔ کس آبادی ہے کہیں درخت کہیں خشک میدان۔ انسان تو رہتے ہیں پتہ نہیں کتنے ہیں۔ اسے بھائی رب العالمین ہے اس کی مخلوق تو چوٹی اور اس سے بھی چھوٹے جانور ہیں جو کہ آپ خود دین سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کیا حساب ہے مخلوق کا پتھر دین کے نیچے دفن 'سمندر میں' ہوا میں آگ میں کون سوچ سکتا ہے اور کہاں تک۔ لیکن اپنی ہر ایک مخلوق کا اسے پتہ ہے۔ ہر ایک کا اپنا وقت مقرر ہے۔ رزق ہے۔ وہ سب کو رزق بھی دیتا ہے۔ کیا اس کی حکومت ہے 'ابھی دیکھا ہی کیلئے' تخیل کو ذرا اور ڈھیل دو اگر ہے تب۔ یہ تو خود اس علاقہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اب آپ دنیا پر نظر ڈالئے کروڑوں لوگ یہاں بستے ہیں۔ لوگوں کو جانے دیں۔ مخلوق ان گنت۔ ہر ایک کا خدا اور جو آپ اس جہاز میں جا رہے ہیں کروڑوں انسانوں میں سے ایک آپ کی کیا ہستی ہے مگر میرا بھی تو خدا ہے 'میرے ساتھ ہے' پھر تخیل تنگ کر دیا۔ اس کائنات میں ایک آپ کی



زمین ہی تو نہیں اچھا نہیں اور سبز ہیں اور تارے ہیں۔ کتنے ہیں؟ حساب نہیں لگا سکتے۔ ان میں بھی تو مخلوق ہوگی۔ جاندار ہی تو اس کی مخلوق نہیں۔ بے جان بھی تو اس کے ہیں۔ کیا اندازہ لگائیں گے مگر پھر بھی دیکھیے وہ آپ کے ساتھ ہے اور اس کا آپ کو پتہ ہے۔ اس کی مرضی تو ہو کر رہے گی۔





## مقابلے فراموشی

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب کہ حالات بہتر ہیں تھے۔ کوہلو پنپے زیاں دن نہیں ہوئے تھے لوگوں سے واقفیت اور حالات کا علم نہیں تھا جب کسی بھی حادثات رونما ہوئے کارروائی کی جاتی اور گرفتاریاں مل میں آتی تھیں پوچھ گچھ شروع ہو جاتی اور چھان بین جاری رہتی۔ یہ کام تو سول حکام کرتے۔ مقدمے کی کارروائی مکمل ہوتے ہوتے بھی دیر لگتی۔

ہم اپنی گاڑی خود ہی چلاتے ہیں اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو نفسیاتی یعنی کچھ ایسی عادات پر لگتی ہے کہ جب تک ڈرائیونگ جاری رہتی ہے سگریٹ پینے کی خواہش نہیں ہوتی۔ سگریٹ کم کرنے کا یہ ایک آزمودہ نسخہ ہے دوسرا یہ کہ ان حالات میں اگر کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آجائے تو تیزی سے خود کارروائی کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک روز ہم جا رہے تھے سڑک خاموش اور سمنان گاڑی چلنے والے نوزگاہ بڑک پر ہی مبنی سوئے تھے تاکہ برابر میں بیٹھا ہوا آدمی پہاڑوں کی ڈھلوان کو خود سے دیکھتا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی غیر معمولی حرکت نہ کرے تو پیسے سے لگا ہی ہو سکے چلتے چلتے ایک بچہ سڑک کے چپے کھڑا ہوا۔ بچہ کچھ سیلتی تھی گاڑی آہستہ کی آہستہ دیکھا تو ایک بچی جس کی عمر تقریباً آٹھ نو سال کی ہوگی دونوں ہاتھ اوپر کئے کھڑی تھی۔ ہم اگر سمنان

یا کھلونے اپنے ساتھ رکھتے تھے کہ جب کوئی بچہ نظر آتا اسے دے دیتے۔ بچوں سے ہمیشہ محبت ہی ہے۔ کھڑی مدلی اور پکی کو بلایا۔ ناز قطار آنکھوں سے آنسو جاری اور زور زدہ گھبراہٹ میں کہہ رہی ہے، اس پکی کا میں رونا عجیب سا لگائیے۔ ان کو اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر غصے میں آکر اس نے سر ایک طرف کر لیا۔

میرے باپ کا کتا قصور ہے جو اسے تم لوگ اپنے ساتھ لے گئے ہو اگر اسے نہیں چھوڑتے تو میرے اوپر ہے جیپ گراؤ میں راستے سے نہیں ہٹوں گی۔

”بیٹا ہم تو تھکے باپ کو جانتے بھی نہیں کسی بڑے آدمی کو باؤ پر چلو میں کہ اس کا نام کیل ہے اور اسے کیوں پکارتی گیلے۔“

”میں کسی کو نہیں بلاتی فیصلہ کرنا ہے تمہارے اور میں نے یا تو تم جیپ چلاؤ اور مجھے ختم کر دو یا میرے باپ کو چھوڑ دو۔“  
 ”پکی کے بولنے کا کچھ انداز ایسا تھا کہ ہم بھی ضبط نہ کر سکے جب پکی نے یہ حالت دکھی تو اس کا حوصلہ بھی بندھا ہمارے ساتھ ایک مری دوست سے وہ بھی نیچے اتر گئے، انہوں نے پکی کو یقین دلایا ذرا آرام سے بات بیان کرو گھبرانے کی کوئی ایسی بات نہیں سارے فوجی اپنے میں کوئی باہر کے تو نہیں جو بلجائز ظلم کریں گے۔“

اچھے اپنے ہیں کبھی کو باپ سے جھگڑا یا تلک کہتے ہیں کہ تیرا باپ بے زہرہ واپس نہیں آئے گا، کافر کسی کو بھی نہیں چھوڑتے میں اپنے باپ کے بغیر نہیں رہ سکتی مگر اسے مار دیا ہے تو مجھے بھی مار دو۔

ہمارے دوست نے پھر دلا سہ دیا، بیٹا ہم سب ملان ہیں ان میں کافر کوئی بھی نہیں ہے تیرا باپ اگر بے گناہ ہے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تیرا حلقہ کدھربے آؤ معلوم کرتے ہیں کہ بات کیا ہے؟

پکی نے جب مسلمان کاندھنا تو عجیب لگا، ہل سے ہم لوگوں کی طرف گھورا، جیسے اسے یقین نہیں آیا ہوا اور خاموش کھڑی ہوئی۔ میرے ساتھ ایک اور افسر بھی۔ دارمی بھی خوب گھنی لگی ہوئی ہے اور بلوچی بھی مددہ بولتے ہیں اتنے میں ابھی اتر کر پکی کے سامنے آئے۔ وردی اپنی ہوئی تھی۔ پکی انہیں دیکھتے ہی نعرہ بے بولی، تو تو مسلمان ہے اور بلوچ بھی ہے کچھ تو خیال کر۔

افسر نے پکی کے سر پر ہاتھ پھیرا، بیٹا گھبرانے کی بات نہیں، ہم سب ہی مسلمان ہیں تو ہم سب کی بیٹی ہے چل میں اپنے حلقے میں لے چل، پوچھتے ہیں کی بات ہے؟

پکی کو اب تیز تر اتر رہا مگر دیر سا ہوا چلا تھا۔ اپنے افسر سے جب اسے اتنا اوس دیکھا تو ہم نے بھی پانی بلوچی بولنے



کی مشق شروع کی۔ اس دفعہ جب ہم غاس کے سر پر ہاتھ پیرا تو اس نے جھٹکا نہیں۔ اب وہ ہیں اپنے حلق کی طرف لے چلی۔ اپنا نام سیوی بتاتی تھی اور پیرا دانی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے آنسو بھی تم چکے تھے بات بھی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی جو ہم سمجھ رہے تھے۔

یہ چلا کہہ کر دن ہوئے ہمارے ایک گشت پر لوگوں نے غار کا گشت نہ گھیرا ڈالا اور کچھ لوگوں کو تھپیاؤں سمیت گرفتار کر لیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں سیوی کے والد صاحب بھی شامل تھے۔ بچی کو یقین دلایا کہ تمہارا باپ اگر بے قصور ہے تو چھوڑ دیا جائے گا۔ کہنے لگی مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ زندہ بھی ہے اور پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔  
”نہیں بیٹا وہ زندہ ہے۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لو۔“

”اگر وہ زندہ ہے تو مجھے پکڑ لو اور اسے چھوڑ دو۔“

اب بچی کے سامنے ہم لا جواب ہو چکے تھے۔ بچی کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ بحث کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی بل میں خیال آیا کہ سول حکام سے سفارش کی جائے کہ اسے ضمانت پر رہا کر دیا جائے، اس زمانے میں کوئی ضمانت دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ فیصلہ کیا کہ اگر کوئی ضمانت نہیں دے گا تب بھی کوئی صورت نکالیں گے آخر بچی کو بار بار بیٹھا کہہ کر مطالب کیا  
”تھوڑی دیر بعد ایک اور بچی آگئی اس نے بھی ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اپنا نام ”جہاں بی“ بتاتی تھی اس کی بھی یہی درخواست تھی ہم نے دونوں سے کہا کہ دونوں ہمارے ساتھ چلو اور اپنے باپ کو ساتھ لے آؤ۔“

حیرانی سے ٹکنے لگیں اور ایک دم اپنی جھکیوں کی طرف پکیں اور تیار ہو کر بھاگی ہوئی واپس آئیں کہ چلیے ان کی مائیں چلا رہی تھیں کہ کافروں کے ساتھ کدھر اس کی جا رہی ہو۔

”نہیں یہ لوگ مسلمان ہیں۔ ہم ضرور جائیں گے اور ابھی آنا کوئی واپس آتے ہیں۔ راستے میں ہمارے مری دوست بولے  
”آپ نے بچیوں کو بیٹھا کہا ہے اب تو اسے نبھانا ہو گا۔ آپ ان کے باپ کو اب چھوڑ بھی دیں تو وہ کہیں نہیں جائیں گے۔  
”بھائی نبھانے کی کوشش کریں گے۔ ہماری بھی تو کچھ مجبوریاں ہیں۔“

”مجبوریاں وغیرہ تو اب بے معنی“ بڑی روایت کے مطابق آپ کو اپنے دھڑے پر قائم رہنا ہو گا۔“ چنانچہ ایسا ہی

کیا۔ سب سے پہلے ہم نے سول حکام سے بات کر لی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ ذمہ داری اٹھاتے ہیں تو میں کوئی اعتراض نہیں۔

جب لڑکیوں نے اپنے باپ کو دیکھا تو دونوں طرف سے حیران تھی۔ بچیاں کہنے لگیں ہیں یقین نہیں آتا کہ تم زندہ ہو پھر ایسی لپٹیں کہ سانس جہاں کی محبت و شفقت طوفان میں کھٹ آئی ہو۔

باتیں شروع کرنے سے پہلے وہی حال کا ردان۔ جلال ہے بچیوں نے حال دیتے وقت کئی مکالمہ یا واقعہ بیان کیا جو جو ہائے دوران کے درمیان ملاقات کے دوران پیش آیا تھا مثلاً کیسے چپ روکی مسلمان اور کلنر والی بات۔ مانی اور لوگ کہتے تھے کہ تم کو (باپ) مار دیا گیا ہے یا مارنے کی تیاری ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب ان لوگوں کو واپس چھوڑنے گئے تو دونوں کہنے لگے۔

جب اور جہاں آپ ہیں بلائیں گے ہم حاضر ہو جائیں گے۔  
بچوں سے ہم نے دریافت کیا "بیٹا یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کس نے بتایا کہ ہم کال رہیں؟"  
"ہم سب بڑے کا یہ کہتے ہیں۔"

"اچھا اب بھی تمہیں کانٹر کھجی ہو بچوں نے نفی میں سر ہلادیا اور مسکراتی ہوئی جگہ کی طرف چل دیں۔  
ہمارے بڑے سیری اور جہاں لی جب تک ہم کو ٹو میں رہتے برابر ہیں ملنے کے لیے آتی رہیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ ایک باپ یہی دعا کر سکتا ہے۔"

فوجی کارروائی کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جب کسی بھی خبر ملتی کہ تخریب کار کسی جگہ جمع ہیں تو رات کی تدبیر میں علاقے کو گیس سے مریے لیا جاتا اور مجمع تخریب کاروں کی چھان بین ہوتی اکثر ایسی کارروائیوں میں تخریب کار مزاحمت کرتے نکلنے کی کوشش کرتے ایک دفعہ ایسی ہی کارروائی کی گئی اور چند ہتھیاروں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔  
کارروائی ختم ہونے کے بعد گرفتار شدہ افراد کی وارنٹوں کو جمع کیا گیا تاکہ ان کی دیکھ بھال کی جاسکے۔

جہاں یہ کارروائی مکمل میں آئی تھی اس جگہ کئی قبیلے موجود تھے ایک روز لوگوں کے وارنٹوں کو دیکھنے گئے کہ پتہ کریں کہ انہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ راشن اور کپڑے وغیرہ ٹھیک طور سے تقسیم ہو رہے ہیں۔ بندوبست سے تو یہ مہینے گزارتے تھے مگر ان کی بات چیت سے شک سا ہوا کہ بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ عورتیں آپس میں بات کرتی تھیں کہ کسی کی بیوی بچے رہ گئی ہے ہم نے اپنے مری دوست سے کہا کہ ذرا آپ معلوم کریں کیا بات ہے۔

ودیرہ محل جو کہ بیرادانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے مدد آئی ہیں۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں کہنے لگے

آپ ہیں ٹھہریں میں تفصیل سے معلوم کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد آئے اور بتایا کہ جہاں کارسوائی ہوئی تھی وہاں کوئی قبیلے تھے۔ تدریجی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مددانی قبیلے کے دس افراد نے نکلنے کی کوشش کی ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی تھیں ایک پیردادانی عورت اور ایک مددانی کی بیوی ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ یہ لوگ اپنی عورت کو تو اٹھا لے مگر پیردادانی وہیں پڑی ہے۔

کمال ہے کئی عورت پھر عورت ہوتی ہے چاہے کسی بھی قبیلے کی ہو وہ غریب تہ نہیں کہاں کب سے ہوئی۔ ہماری تشریش میں اور بھی اضافہ ہوا۔ لوگوں کو جمع کیا اور تفصیل سے پوچھا شروع کیا گا غریب کہاں پڑی ہے؟ کتنے دن سے وہاں ہے اور کسی بیوی ہے۔ تہ ملا کہ ایک دن اور ایک مات تو گزری ہے۔ جہاں پر وہ ہے نہ پانی ہے وہاں اور نہ کھانے کا کوئی انتظام۔ جس شخص کی وہ بیوی ہے وہ کوہلو میں نظر بند ہے بڑا بھڑی تھی جو صاحب غریب عورت کو چھوڑ کر آئے تھے انہیں طلب کیا اور پوچھا اچھے مرد ہو کہ غریب عورت کو اکیلا چھوڑ آئے اور کسی کو بتایا بھی نہیں کیا کریں ہمارے قبیلے کی عورت تو تھی نہیں۔ اب جس کی ہے وہ جانے۔ ہماری سپردگی میں بھی کوئی کر دیتا تب بھی ہم کو نہ کرتے۔ بچہ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ وقت بھی تھا۔ اُن سے کہا کہ جناب ہلی کا پٹر منگاتے ہیں آپ ہمارے ساتھ چلے چوبیس گھنٹے سے زیادہ ویسے ہی گر چکے ہیں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

شکر بولے اب تک تو وہ ویسے ہی مر چکی ہوگی۔ جبکلی جانو کہ کب زخمی ہو گئی مالت میں چھوڑتے ہیں جہاز پر بیٹھ کر آپ کو راستہ بتانا مشکل ہے۔ ویسے رات کا وقت تھا میں جگہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں۔ بہت غصہ آیا کہ انسان کی زندگی بھی لوگ سستی سمجھتے ہیں یا کہ قبیلہ اپنا نہیں مگر سب انسان تو ہیں۔ دُور پہنچنے والی ہمارا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے وقت تو بڑا ہے اس عورت کے مرد کا نام ہم نے پتہ کر لیا ہے اب کوہلو چل کر اسے ہی سمجھتے ہیں اگر قسمت ہوئی تو زندہ پہنچ جائے گی۔

کوہلو پہنچے پہنچتے مالت ہو چکی تھی۔ مرد کو لہوایا تہ چھوڑ کر تسلیم شدہ فراری ہے سول حکام نے ان کے خلاف کئی مقدمات درج کر رکھے ہیں اور وہ انہیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے تہ تسلیم نہیں۔ اب کیا کیا جائے۔ ہمارے ایک نوجوان انسینڈانی بوئے کہنے لگے ساری باتیں درست مگر اس میں عورت بچاری کا کیا قصور ہے میں اس

کے مرد کے ساتھ چلتا ہوں۔ اگر آج رات تک اس کے پاس پہنچاؤ نہ ملے تو غریب موسم کی شدت اور بھوک پیاس سے مر جائے گی۔ اس کی موت کے ہم سب ذمہ دار ہوں گے۔

بات دل کو لگی مرد نے بھی عاجزانہ گزارش کی۔ مان لیں میں بہت ہی گناہگار ہوں۔ اگر آپ مجھ پر رحم کر کے چھوڑ دیں تو میں ضرور اپنی بیوی کے ساتھ حاضر ہو جاؤں گا۔ بیوی کا تو مجھے پتہ لگ گیا مگر بچوں کا بھی پتہ کرنا ہے۔

ہمت کی مرد سے کہا تم جاؤ اور بھی جاؤ تمہارے ساتھ ڈاکٹر بھی جائے گا۔ آنا تمہاری مرضی پر ہے۔

دو دن بعد اپنے خاندان کے ساتھ ہمارے دوست خود حاضر ہو گئے۔

بیوی کے پاؤں کی بڑی ٹوٹی ہوئی تھی وہ بھی علاج کے بعد ٹھیک ہو گئی۔

ہم نے اپنے مری دوستوں سے اکثر پوچھا کہ بھائی ہماری کھوپڑیاں نہیں آتا کہ کیسے ایک عورت کو بے یار و مددگار چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اس رواج ہے کہ دوسرے قبیلے پر وہ نہیں کی جاتی۔

اب ذرا اچھے دنوں کی بات کرتے ہیں۔ ہماری دوستی مری بھائیوں سے کافی بڑھ چکی تھی۔ اکثر ملائے کھانا چکر لگایا کرتا تھا۔ کچھ گاڑیاں ساتھ ہوتیں اور کوشش یہ رہتی کہ جہاں تک دود دراز ملائے میں جاتا، لیکن بوجھ بھگایا جائے گا۔ گاڑیوں کے راستے تو ناپید تھے۔ عموماً بغیر راستوں کے ہی گاڑیاں چلائی جاتیں۔ ربط قائم کرنا ضروری تھا تا کہ دوستی بڑھے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہے۔ راستہ بدلنے اور بات چیت میں مرد دینے کے لئے ہمارے مری دوست بھی شامل ہو گئے۔

ایسے ہی ایک دن وہ بہت ملا جملے جانکے گاڑیوں پر آئے۔ چلتے چلتے جب گنا گئے تو ایک بڑے تھوڑے قیام کے لئے رکے۔ ہمارے مری دوست بھی وہاں جمع ہو گئے۔ باتیں ہوتی ہیں کسی نے بتایا کہ یہاں سے تھوڑی دور ایک سس ہے جہاں ایک عورت بیمار ہے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ سوچا گئے تھوڑی بیماری کی حیثیت کی۔ رہنے۔ در حقیقت عورت کے جگر پر ورم تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہے کہ اگر مریضہ کو چاہئے تو فوری آپریشن ضروری ہے۔ ویسے آپریشن کا یہاں ہونے کی امید کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ چلے کوشش کیے جیتے ہیں۔

سب سے بڑی مشکل اس بات کی تھی کہ مریضہ کی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کچے راستے سے



ایک دفعہ ہماری سفارش پر ہدایت دی گئی کہ نمونے کے طور پر پینج کمیونٹی سنٹر (COMMUNITY CENTER)

بنائے جائیں ہر ایک سنٹر میں اسکول ڈسپنسری۔ دوکانیں کھولیں اور تالاب مہیا کیا جائے تاکہ قبائلی کسی حد تک خانہ بدوشی ترک کر کے آباد ہونا شروع ہو جائیں ان کی قریبی زمینوں کو کھیتی آباد کیا جائے اگر لوگوں کو آباد کرنا مقصود ہے تو پھر روزی کمانے کے ذرائع کا مہیا کرنا بھی لازمی ہے۔ فی الحال یہ ذرائع محدود ہیں۔

کام زور دشوار سے جاری ہوا۔ یہ تو لازمی تھا جنرل ٹکا خان کو ٹیلیفون پیار بار اس کام کی رفتار بتائی جاتی۔ پھر وہ خود بھی اس کام کو دیکھنے آئے۔ جب کام مکمل ہو گیا تو ہم نے سوچا کہ اب سینٹر خود ہی آباد ہوتے رہیں گے جو بار اکام تھا ہم نے کر دیا۔ مزد فرائض اتنے زیادہ تھے کہ ہمارا دھیان ان کی آباد کاری کی طرف سے ہٹ گیا۔ ہمیں پاک خبر ملی کہ جنرل ٹکا خان کو حلقہ رہے ہیں۔ آتے ہی انہوں نے ایک سنٹر کو دیکھنے کی طاہر کی سینٹر کو جلوسے تقریباً چاس میل کے فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ ویسے بھی ہم اپنے فرائض ادا کر کے کوٹہ جانے والے تھے اور سنٹر میں بھی بہت دنوں سے جانا نہیں ہوا تھا۔ سنٹر کے قریب ہی کاپٹر اترامری قبائل چیف آفس سٹاف آرمی کو دیکھ کر جمع ہو گئے انہیں تو اب ہی جانتے تھے اور پوچھتے تھے اور بات کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ شکایتیں ہیں کہ جاری ہیں۔ یہ کام تو فوج کا نہیں ہے۔

کام بے شک آپ کا نہیں ہے مگر ان لوگوں کی مدد کرنا تو آپ کا فرض ہے۔ زمینیں ٹھیک کرنے کے لئے بل ڈورز اور ٹریکٹر بھی تک نہیں آئے ہیں۔ کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے ہیں۔

کوشش سے کیلبراد انہیں تو یہاں موجود ہونا چاہیے۔

اسکول تو بن گئے استاد کوئی نہیں ہے

لکھا تو ہے ابھی تک کوئی تعینات نہیں ہوا۔

آپ لوگوں کا یہاں ہونے سے کیا فائدہ ہے!

شکایتیں ہوتی رہیں۔ ہم جواب تلاش کرتے رہے قصور کلیتہاً ہمارا نہ تھا مگر کچھ تو تھا۔ لیکن ہیں کچھ اس انداز سے

آگاہی دلائی گئی کہ ہم خود ہی شرمندہ تھے اور کوتاہیوں کا احساس اشد بہرہ تھا۔ روایتی ڈانٹ پھکار سے

شاید وہ بت نہ بنتی۔

ایک دفعہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو حلو تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ جنرل نکا خان بھی تھے۔ وزیراعظم کی آمد سے پہلے ہیں ان کے ہمراہ آنے والے ہانوں کی ہدایت بھی دی گئی تھی۔ ان کی تعداد کے مطابق سیٹی پر گارڈین کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ جب اسے ہلی کو پڑنے پڑے تو معلوم ہوا کہ وہاں فہرست سے سین زیادہ ہیں۔ گارڈین بھر چکی تھیں۔ جنرل نکا خان آرام سے ایک صیپ میں بیٹھ جاکر بیٹھ گئے۔ ہم اپنی نااہلی پر پشیمان ہوئے کہ صیپ ایک علیحدہ ان کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ مگر ایسا کیوں ہوا؟ بھاگ دوڑ کر کے ایک اور صیپ منگوائی مگر جنرل صاحب نے مسکرتے ہوئے کہا: کوئی بات نہیں۔ کوہلو میں صیپ مہیا کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔

وزیراعظم بھٹو اہلی پیڈ سے نظر بندوں کو دیکھنے گئے۔ سب ان کی آمد کے منتظر تھے۔ تمام چاروں طرف جمع ہو گئے۔ سلام دعا کے بعد ہر ایک نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ اسی دوران ایک مری قرآن شریف پڑھا رہے ہوئے آگے بڑھا۔ ہمارا فیصلہ آپ اس کتب پر کریں۔ کلام پاک کو دیکھ کر شروع میں ہم سب گھبرائے۔ کلام پاک اٹھانے والا زندہ زود سے کہہ رہا تھا: آپ میں معافی دے دیں ہم سے غلطی ہو گئی آئندہ ایسا کوئی قصور سونڈ نہیں ہوگا۔

وزیراعظم نے بڑے تحمل سے کہا: ٹھہریے ٹھہریے۔ اگر آپ لوگوں نے کلام پاک پر ہی فیصلہ کرنا ہے تو آپ سب کلام پاک پر ہاتھ رکھیے میں بھی اس پر ہاتھ رکھتا ہوں۔

معلوم ہوتا تھا کہ سب اس بات کے منتظر ہیں۔ سب نے جلدی جلدی کلام پاک کو چومتے ہوئے اس پر ہاتھ رکھا اور ایک زبان ہو کر بولے: ہمیں معاف کر دیا جائے آئندہ سے ہم حکومت پاکستان کے وفادار رہیں گے۔ کچھ جذباتی بھی ہو گئے۔ آخر میں کہنے بان ہو کر چلے: پاکستان ہماری جان اور زندگی ہے۔ پاکستان زندہ باد۔ جب نے فریتم ہو چکے تو وزیراعظم صاحب نے بڑے تحمل اور سنجیدہ انداز میں کہا شروع کیا۔ بات کہنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ خوف طاری ہے کیونکہ ہاتھ کلام پاک پر ہی تھا۔ میں بھی آپ سب سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اور آپ سب کو راکیا جاتا ہے۔



# اشکاریہ

ج

۲۱۹-۲۲۹-۲۳۹	جہاں بی
۲۹	جہانگیر
۶۳	جیکب

ج

۳۶	جج رائے
۳۵	حارث بن مرہ الجبزی
۳۵	حکیم بن جبلة العربی

ح

۲۱۹	داتا گنج بخش حضرت
۳۶	دایرہ راجا
۱۰۸-۸۵	دودا خان
۱۳۱	دعنی رام
۵۳	دیو گندھاری

خ

۹۷	خیر محمد پوادی
----	----------------

ص

۵۸-۵۷	صامن
۵۷	ریگان اورند

س

۲۵	سکندر اعظم
۲۷	سلطان حسین نرزا
۲۸	سلطان محمود
۹۱	سیمان
۵۳	سادھ جوگی
۳۶	سہاسی (راجا)
۳۶	سہر رائے (راجا)
۵۲	سیپال (راجا)
۵۳	سیوا (راجا)
۳۵	سیوی درانی
۲۳۰-۲۲۹-۲۱۶	سیوی

## اشخاص

الف

۳۵	ابن
۴۸-۴۷	ابوالقاسم فردوسی (فردوسی)
۲۹	اکبر (شاہ)
۵۸	امام حسین
۲۱-۲۰	امام غزالی
۱۰۵-۳۷	امیر تیمور
۴۹-۴۶-۴۵	امیر حمزہ (حضرت)
۶۰-۳۷	امیر شجاع الدین ذوالنون ارغون
۴۰	امیر ذبیح علیگیر
۶۳	ایبٹ
۴۸	ایل ایم ڈیمس
۸۳-۵۱	این فرسن مسٹر
۹۱-۹۰	ایوب خان

ب

۳۷	بابا دشاہ
۶۹-۶۲	بجائیاں
۴۰	بجٹار خان (جن مرزا خان بارون)
۲۳۵-۱۹۲	بھٹو (جناب) وفاقہ علی بھٹو
	وزیر اعظم پاکستان

۹۶	بھائی
۱۷۵-۱۷۴	بیو جیپ، بیو جی بی کرنل
۶۳-۶۲-۶۱	بی بی بانی

پ

۵۳	پانی ناتھ
۵۰	پیر در شاہ

ت

۵۳	تھراسترا راجا
----	---------------

ث

۲۳۵-۲۳۴-۲۳۳	ٹکا خان بھڑل
۲۳۲	جیت آن آر می شاف



## ش

۳۷	شاہ بیگ (ارغون)
۳۸	شاہ حسن (ارغون)
۳۹	شاہ جہاں
۴۰	شاہ جہ
۴۱	شاہ شجاع
۵۲	شکستی دراجا قندھار
۶۱	شاہ مرید
۹۷	شاہ منواز

## ف

۴۲	فضل مقیم خان، ڈیفنس سگری
	میجر جنرل (ریٹائرڈ)

## ع

۴۵	عبدالرحمن
۳۵	عبداللہ بن عامر دگور عراق
۳۵	عثمان بن حضرت
۴۹-۳۵	علی بن حضرت
۷۰-۶۹	علی خان
۹۶	علی گل، وڈیرہ

## ک

۵۳	کالی دیوی
۵۴	کرشن بہاراج
۴۷	کیخڑ
۴۷	کیا دوس
۶۳	کیبل

## گ

۲۳۱-۲۳۰	گنج علی، وڈیرہ
۵۸	گوہر جتئی
۶۰-۵۸-۵۷-۳	گوہرام، سردار، میر
۴۰	مجت خان

۴۱-۳۰	محمد خان حسن بریگیڈ برادرہرات
۴۶-۳۶-۳۵	محمد بن قاسم
۴۵	محمد بن ہارون
۳۵	معاویہ، امیر
۴۰	محمد معین الدین، خیرزادہ
	رطب بدوانا خان
۳۶	محمد غزنوی، سلطان
۴۰	مرزا خان باروزئی
۴۱	معمری خان
۶۳	میر باگر خان
۵۲-۳۹	میر جلال رحمان خان
۵۰	میر حسن براہم
۶۰-۵۸-۵۷-۵۰-۳۹	میر چاکر
۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۹۰-۶۱۸	
۶۳	میرداد
۴۶	میر سید دارخان گنگوری
۶۳	میر شہداد
۴۰	میر عبداللہ خان (خان قلات)
۳۹-۳۸-۳۶	میر مصوم
۴۶	میر محل خان نصیر
۶۹	مسند و خان
۶۳	میر نوح
۱۰۵	میر نزار خان گنگرانی
۵۳	مہادیو

## ن

۴۱-۴۰	نادر شاہ
۵۲-۴۷	نقورام، رائے بہادر لالہ
۴۰	نور محمد دکنپورہ
۱۹۸-۱۹۷	نہال
۹۱	نیرن
۳۶	نیروز بادشاہ

ت

۱۱۰-۶۰-۶۰	تدری (دھڑ پھاڑ)
۲۱۸	ترک کھنڈ
۸۲	ترمین (مقام)
۲۷	تلی (نالہ)
۲۱۸-۱۹۷	تنگی دہرنگی (چاکرنگی)
۶۲	

ج

۹۳	جنزدان (مقام)
۶۰	جھلوان
۲۰۰	جنوب مشرقی ایشیا

ح

۶۲-۲۹-۲۸	حلب
۲۱۸-۲۷	چاکر نالہ

خ

۶۲-۲۶	خراسان
-------	--------

>

۱۸	دبک دگاؤں
۲۷	دجلہ
۲۱-۳۲-۳۳	دردہ بولان
۲۰-۲۹-۲۲	دریائے سندھ
۱۹۰-۱۳۹-۱۱۱	دکن (تحصیل)
۲۶-۲۵	

>

۶۲	ڈنگن (پھاڑ)
۵۰	ڈھاڈر
۶۳-۳۴	ڈیرہ جات
۱۹۰-۱۸۹-۶۰-۲۵	ڈیرہ غازی خان

سا

۱۸۹	رحیم پور خاں
۳۷	رند - لاشاری جنگ

ث

۵۰	ٹہ
۶۲-۶۰-۳۸	ٹہاویں
۴۷	ٹہری اسمتہ ولیم
۵۰	ٹہقیان بیورخ
۴۷	ٹہور وڈ وٹس

ی

۴۰	یار محمد کھوڑہ (خدا لیر خاں قبای) نونہ
۲۹-۲۸	یغریہ

○ مقامات

الف

۲۱۰-۲۰۰-۱۹۷-۲۸	افریقہ
۴۱	الغفٹان
۲۶	انور
۹۲	انگلتان
۸۱	ایران

ب

۲۹	بآ
۱۰۹-۸۶	بارکمان (کیان) تحصیل
۲۶-۲۵	
۲۱۲-۱۳۷	بالا ڈاکہ (مقام)
۳۶	بگنی (علاقہ)
۳۷-۳۶-۳۵-۲۶	بلوچستان
۲۱۷-۱۷۵-۵۲-۲۸	

۴۹	بہرپور
۳۸	بہرک
۱۸۹-۶۳	بھاولپور

پ

۱۹۸-۱۱۶-۱۱۱-۸۶-۸۱-۶۳-۳۶-۱۰-۵	پاک
۲۳۵-۲۰۰-۱۹۸-۱۷۶	
۱۹۸-۱۶	پشاور
۶۳-۶۰	پنجاب

۱۸ - ۱۶	کتاب و انگار (پہاڑ)
۱۱۳	کٹ منڈائی
۵۸ - ۵۷ - ۵۳ - ۴۹ - ۳۶	کچ (کچی) کچ
۴۹	کربو
۲۱۱ - ۱۹۸ - ۱۶	کراچی
۲۷	کریاک (دانا - تال)
۲۰۵	کسل
۳۴	کول پور
۸۱ - ۲۰ - ۱۸ - ۱۷ - ۱۵ - ۱۰ - ۹	کولپور
۱۱۲ - ۱۱۱ - ۱۰۵ - ۱۰۳ - ۹۷ - ۹۶ - ۹۳	
۲۵ - ۱۹۷ - ۱۹ - ۱۸۹ - ۱۸۷ - ۱۵۷ - ۱۱۳	
۲۲۲ - ۲۲۳ - ۲۲۱ - ۲۲۷ - ۲۱۷	
۲۰۴	کولھو دی
۱۹۸ - ۱۹۷ - ۱۱۶ - ۸۶ - ۶۰ - ۱۶	کوتل پشین
۲۱۹ - ۲۱۸ - ۲۱۷	

## ق

۵۷ - ۵۴ - ۵۳ - ۴۰	قوت
۵۳ - ۳۹ - ۳۷	قندھار (گندھار)

## گ

۶۰ - ۳۸	گجرات
۹۷ - ۹۶	گریزی (وادی)
۳۹	گندارا

## ل

۲۱۱ - ۱۹۸	لہور
۲۱۷ - ۱۱۲ - ۱۱۱ - ۲۵ - ۱۸ - ۱۶	لورالائی

۲۰۶	لورالائی ہسپتال
۹۷ - ۲۰ - ۱۸	لوہار کی ملک (فوجی کیپ)
۵۱	لیپ لینڈ

## م

۲۳۳ - ۲۰۵ - ۲۰۳	مری ہسپتال کوہلو
۵۳	مستونگ
۵۷ - ۵۳ - ۴۹ - ۳۶	مکوان
۶۰ - ۴۰ - ۳۷	ملتان

## ن

۲۲۱	زیارت
-----	-------

## س

۶۳	سامیوال (ٹنگری)
----	-----------------

۲۷ - ۲۶ - ۲۵ - ۲۱	سبئی (سیوی سیستان)
-------------------	--------------------

۴۰ - ۳۹ - ۳۸ - ۳۷ - ۳۵ - ۳۴	
-----------------------------	--

۶۱ - ۶۰ - ۵۸ - ۵۷ - ۵۴ - ۵۳ - ۴۱	
----------------------------------	--

۲۱۹ - ۲۱۸ - ۲۱۷ - ۱۱۳ - ۹۵ - ۸۳	
---------------------------------	--

۳۹	ست پور (پہاڑ)
----	---------------

۶۳	ست گڑھ
----	--------

۲۶	سلیمان پلشو (پہاڑ)
----	--------------------

۲۵	سجادی
----	-------

۶۳ - ۶۰ - ۴۶ - ۴۱	سندھ
-------------------	------

۳۸ - ۳۶ - ۳۵	
--------------	--

۱۱۰	سوڈن تھل (پہاڑ)
-----	-----------------

۱۱۳ - ۲۷	سہالو (پہاڑ)
----------	--------------

۴۹	سیستان
----	--------

۹۸	سیوستان (رک - بٹی) سیوی - رک - بٹی
----	------------------------------------

۹۸	سیلکوٹ
----	--------

## ش

۵۳	شال
----	-----

۴۶	شام
----	-----

۹۸	شکر گڑھ
----	---------

۲۳۲ - ۱۱۶ - ۱۱۳	شمالی (شمالی علاقہ)
-----------------	---------------------

## ع

۴۶ - ۳۵	عراق
---------	------

۴۷	عربستان
----	---------

## ف

۴۷	فوات
----	------

## ک

۶۰	کاشمیر
----	--------

۹۱ - ۸۶	کالاباغ (مقام)
---------	----------------



ت  
۲۶ ترمین (قبیلہ)

ث  
۱۰۹ - ۹۷ - ۷۷ شکیانی شعلانی (قبیلہ)

ج  
۲۹ جگانی (قبیلہ)

۷۷ جردار

۷۷ جلبانی

خ  
۷۷ خازانی

۷۷ خازانی

د  
۴۱ درانی (قبیلہ)

۵۰ - ۴۸ دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

دووانی (قبیلہ)

۲۰ منڈے ٹک

۱۱۳ - ۱۱۲ - ۱۱۱ منترنی (مقام)

۷۰ - ۶۹ مورانی (علاقہ)

۹۹ - ۷۰ - ۶۱ - ۶۰ - ۲۷ میوند (ہونڈ)

۲۱۸ - ۱۹۰

ن

۲۷ ناڈی (دیچی) نالہ

۲۵ نصیر آباد

۹۷ پنڈا (مقام)

و

۲۷ ونگن پھاؤ

۴۹

۴۱ ہارین بند

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵ ہرنائی

ہندوستان

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵

۱۷۵ - ۵۲ - ۳۸ - ۳۵



۵۰ - ۴۹	نوحانی بوج
۴۸	نوشیروانی (قبیلہ)
۴۸	وایطانی (قبیلہ)
۲۶	وہبی (قبیلہ)
۴۹	ہوت (قبیلہ)

## کتاب

۴۸	پاپور پوٹری آف دی بلوچستان
۵۲ - ۴۷	تاریخ بلوچستان (لالہ نقوڈ بی آئی ای)
۴۶	تاریخ بلوچستان (میر گل نصیر خان)
۵۱	دی سوشل آرگنائزیشن آف دی بڑی بلوچ
۴۸ - ۴۷	شاہنامہ (نور دوی)
۱۷۵ - ۱۷۴	فرخسیر کرائم ریگولیشن
۲۱۹	کشف المجوب
۴۶	ہشتری آف بوج ریس
۴۷	ہشتری آف دی ورلڈ

۸۴ - ۸۳ - ۸۲	کنڈانی (قبیلہ)
۴۹	کھوسہ (قبیلہ)
۱۰۹ - ۶۴ - ۲۴	کیتھران (قبیلہ)
۴۸	گجکی (قبیلہ)
۴۸	گیلانی قبیلہ
۷۷	گوسرانی
۶۰ - ۵۸ - ۵۴ - ۵۰ - ۴۸ - ۳۷	لاشاری (قبیلہ)
۶۰ - ۵۴ - ۳۷	لنگاد (قبیلہ)
۷۷	لوہارانی
۱۱۲ - ۱۱۱ - ۲۶	لونی (پٹھان)
۷۷	لوہری کش
۷۷	منہان
۲۳۱ - ۱۰۹	منڈانی (قبیلہ)
۴۱ - ۳۳ - ۲۷ - ۱۵ - ۹	مری (ملاقہ قبیلہ)
۹۵ - ۹۰ - ۸۶ - ۸۵ - ۸۲ - ۸۱ - ۷۹ - ۵۸ - ۵۱	
۱۱۳ - ۱۱۲ - ۱۱۱ - ۱۰۸ - ۱۰۶ - ۱۰۳ - ۹۹ - ۹۸	
۱۵۷ - ۱۵۳ - ۱۴۷ - ۱۴۴ - ۱۴۳ - ۱۳۶ - ۱۳۵ - ۱۲۹ - ۱۱۹	
۱۹۶ - ۱۷۱ - ۱۷۰ - ۱۶۹ - ۱۶۷ - ۱۶۶ - ۱۶۵ - ۱۵۷	
۲۳۵ - ۲۳۴ - ۲۳۳ - ۲۳۰ - ۲۲۶ - ۲۱۷ - ۲۰۷ - ۲۰۵	
۱۷۴	مرشا (قبیلہ)
۲۶	ناصر (نامری)



تصحیح

نوٹ ۱۔

صفحہ ۸۶ ترمیمیں لائن پر جنوری ۱۹۶۷ء میں کیں گئے۔

# بلوچستان

ماضی - حال - مستقبل

